مطالعہءادب

(حصہ دوم)

اُردو نوٹس معہ سمسٹر نصاب ونمونہ پرچہ سوالات

برائے

بی اے، بی کام، بی ایس سی (سال دوم- میقات سوم)

نیا نصاب 2015-16

گراج گورنمنٹ کالج نظام آباد

از: ڈاکٹر محمد اسلم فاروقی صدر شعبہ اُردو گراج گورنمنٹ کالج نظام آباد

MUTALEA e ADAB

BA,B.COM.BSc II YEAR III SEM

URDU NOTES,SYLLABUS& MODEL QUESTION PAPER

NEW SYLLABUS 2015-16

GIRRAJ GOVT COLLEGE(A) NIZAMABAD

BY: **DR MOHAMMED ASLAM FAROQUI**

HEAD DEPT OF URDU

GIRRAJ GOVT COLLEGE NIZAMABAD

(AUTONOMOUS NAAC RE ACCREDITED WITH B)

REVISED SYLLABUS FOR URDU SECOND LANGUAGE

BA.B.Com& B.Sc SECOND YEAR 2015-16

SEMESTER- III MODULE III

(Prose and Poetry)

یونٹ1۔ 1۔ مثنوی۔ امن نامہ۔ از: جاں نثار اختر

2۔ داستان۔ سب رس کے چند حصے۔ از: ملا وجہی

یونٹ2۔ 1۔ قصیدہ۔ درشان حمید الدولہ۔ از: شیخ محمد ابراہیم ذوق

2۔ ناول۔توبۃ النصوح سے۔نصوح اور سلیم کی گفتگو۔از: ڈپٹی نظیر احمد

یونٹ3۔ 1۔ مرثیہ۔ گرمی کا سماں۔ از میر ببر علی انیس

2۔ انشائیہ۔ ذوق چائے نوشی۔ از: ابوالکلام آزاد

یونٹ4۔ 1۔ قطعات۔چھوڑ لٹریچر کو اپنی ہسٹری کو بھول جا۔از: اکبر الہ آبادی

2۔ انداز بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے۔از: علامہ اقبال

یونٹ5۔ 1۔ کہانی۔ اولڈ ایج ہوم۔ از: شیخ احمد ضیاء

2۔ روداد نگاری۔دئے گئے حالات کی روداد لکھنا

خارج کردہ نصاب: رپورتاژ: کل ہند کانفرنس۔از۔اظہار اثر

شامل کردہ نصاب: طنزیہ مضمون/افسانہ۔اولڈ ایج ہوم۔از: شیخ احمد ضیاء

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

GIRRAJ GOVT COLLEGE NIZAMABAD

(AUTONOMOUS NAAC RE ACCREDITED WITH B)

MODEL PAPER FOR URDU SECOND LANGUAGE

BA.B.Com& B.Sc SECOND YEAR 2015-16

SEMESTER- III

(Prose and Poetry)

Time: 2-1/2 hrs Max Marks : 70

PART A----(حصہ الف)----

ذیل میں سے تمام سوالات کے جوابات مطلوب ہیں۔ ہر سوال کے دو نشان مقرر ہیں۔ 5x2=10

1۔ ملا وجہی کا تعارف بیان کیجئے۔

2۔ مرثیے میں جذبات نگاری کی اہمیت بیان کیجئے۔(یا) قصیدے کے جز تشبیب کے بارے میں نوٹ لکھئے۔

3۔ زندگی کو بہتر گذارنے مولانا آزاد نے کیا نسخہ بیان کیا ہے۔

4۔ اقبال کے شعری مجموعوں کے نام لکھئے۔

5۔ افسانے کی تعریف کیجئے۔

PART B----(حصہ۔ب۔)----

ذیل میں سے کوئی پانچ سوالات کے جوابات ایک پیراگراف میں لکھیں۔ ہر سوال کے 4 نشانات مقرر ہیں۔ 5x4=20

1۔ جان نثار اختر کا تعارف بیان کیجئے۔ 2۔ داستانوں میں مافوق الفطرت عناصر کیوں ہوتے ہیں۔

3۔ مرثیے میں کس واقعہ کو بیان کیا جاتا ہے۔ 4۔ سلیم کو کیوں کھیلوں سے نفرت ہوگئی تھی۔

5۔ قصیدے میں شاعر بادشاہ سے کیا طلب کرتا ہے۔ 6۔ مولانا آزاد کی جیل میں کیا مصروفیات تھیں۔

7۔ انشائیہ کی تعریف کیجئے۔ 8۔ اولڈ ایج ہوم کی سماجی برائی کیا ہے۔

PART C----(حصہ۔ج۔)----

ذیل میں سے تمام سوالات کے جوابات مطلوب ہیں۔ ہر سوال کے 8 نشانات مقرر ہیں۔ 5x8=40

1۔ مثنوی کی تعریف کیجئے اور اس کے اجزائے ترکیبی بیان کیجئے۔ (یا) مثنوی امن نامہ کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھئے۔

2۔ انتخاب سب رس سے کوئی دو اخلاقی باتیں لکھئے۔ (یا) داستان کی تعریف کیجئے اور اردو داستان نگاری کے بارے میں لکھئے۔

3۔ مرثیہ ''گرمی کا سماں'' کی روشنی میں انیسؔ کی مرثیہ نگاری کا جائزہ لیجئے۔ (یا) ۔افسانہ ''اولڈ ایج ہوم'' سے کیا سبق ملتا ہے۔

4۔ ''نصوح کی سلیم سے گفتگو'' میں کیا اخلاقی باتیں بیان کی گئی ہیں۔ (یا) انشائیہ ''ذوق چائے نوشی'' کا خلاصہ لکھئے۔

5۔ آپ کے محلے میں مچھروں کی کثرت ہے۔دفتر بلدیہ کو ایک رپورٹ لکھ کر صفائی کے لئے یاد دہانی کرائیں (یا)
آپ بس میں سفر کر رہے ہیں اور بس کی ٹکر سے ایک نوجوان زخمی ہو گیا۔اس واقعہ کی رپورٹ لکھتے ہوئے آپ ایمرجنسی وہیان کو کس طرح بلائیں گے تفصیل سے لکھئے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

مطالعہ ادب اُردو زبان دُوّم نوٹس

بی اے۔بی ایس سی۔بی کام۔سال دوم۔سمسٹر سوم

برائے گراج گورنمنٹ کالج نظام آباد (نئے نصاب کے مطابق)

(حصہ نظم)

مثنوی امن نامہ از: جان نثار اختر

سوال: مثنوی کی تعریف کیجئے۔اردو میں مثنوی نگاری کا جائزہ لیجئے؟

جواب: **مثنوی کی تعریف:**- مثنوی لفظ مثنیٰ یا تثنیہ سے بنا ہے۔جس کے معنی دہرانا یا دو کے ہیں۔شاعری کی اصطلاح میں دو دو مصرعوں کے ذریعہ لکھی جانے والی ایسی نظم جس کے ہر شعر میں قافیہ ردیف بدلتا رہتا ہے۔اسے مثنوی کہتے ہیں۔مثنوی طویل بیانیہ نظم ہوتی ہے جس میں کوئی قصہ یا واقعہ یا کسی موضوع پر تفصیلی بات پیش کی جاتی ہے۔مثنوی میں اشعار کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔قدیم دور کی مثنویاں کئی ہزار اشعار پر مشتمل ہیں۔مثنوی کے لئے شاعری کی سات بحریں اور اوزان مقرر ہیں۔روایتی مثنوی نگار شعراء نے مثنوی کے آٹھ اجزا قرار دئے ہیں۔۱۔حمد۔۲۔نعت ۳۔منقبت۔۴۔مناجات۔۵۔مدح شاہ ۶۔سبب تالیف ۷۔آغاز قصہ ۸۔اختتام۔دور قدیم کی مثنویوں میں شاہی دور کے قصے بیان کئے گئے۔اس لئے انہیں منظوم داستانیں بھی کہا گیا۔ان مثنویوں کے کردار شہزادے شہزادیاں اور محلوں میں رہنے والے لوگ ہوا کرتے تھے۔عام انسانوں کا ذکر مثنویوں میں نہیں کیا جاتا تھا۔شعرا بادشاہ سے انعام واکرام کے حصول کی امید میں اپنی مثنویوں میں شاہی گھرانوں کے لوگوں کے کارنامے پیش کرتے تھے۔قدیم دور کی مثنویوں میں مافوق الفطرت عناصر جیسے جن، دیو، بھوت، پریت، جادوئی تعویز، جادوئی گھوڑا وغیرہ کا ذکر ملتا ہے۔ان عناصر کی مدد سے مثنوی کا ہیرو شر پر فتح حاصل کرتا تھا۔اردو مثنوی کی یہ خاصیت رہی کہ ان میں جن مافوق الفطرت عناصر کا ذکر کیا گیا ان میں سے بعض باتیں سائنسی ایجادات کے ذریعے حقیقت کا روپ لے سکیں۔جیسے موجودہ دور کی ایجادات ٹیلی ویژن، فون اور ہوائی جہاز وغیرہ کے اشارے قدیم مثنویوں میں ملتے ہیں۔

اردو میں مثنوی نگاری کا ارتقاء: اردو کی پہلی مثنوی فخر دین نظامی کی ''کدم راؤ پدم راؤ'' ہے دکن میں کئی شاہکار مثنویاں لکھی گئیں۔ جن میں قطب مشتری از ملا وجہی اور علی نامہ از نصرتی وغیرہ مشہور ہیں۔شمالی ہند کی دو شاہکار مثنویاں میر حسن کی ''سحر البیان'' اور دیا شنکر نسیم کی ''گلزار نسیم'' مشہور ہیں۔سحر البیان کو دبستان دہلی کی شاہکار مثنوی کہا جاتا ہے۔اسی طرح مثنوی گلزار نسیم دبستان لکھنو کی نمائندہ مثنوی سمجھی جاتی ہے۔مثنوی یوسف زلیخا، قطب مشتری اور زہر عشق اردو کی مشہور عشقیہ مثنویاں ہیں۔قدیم مثنوی میں شاہی دور کے قصے بیان

ہوئے ہیں۔ جدید مثنوی میں موضوعات بدلے۔ حالی نے ''بیوہ کی مناجات'' اور ''چپ کی داد'' جاں نثار اختر نے ''امن نامہ'' کیفی اعظمی نے ''خانہ جنگی اور علی سردار جعفری نے ''جمہور'' کے نام سے نئے دور کی مثنویاں لکھیں۔

سوال: جان نثار اختر کی مثنوی ''امن نامہ'' کا خلاصہ لکھئے۔

جواب: مثنوی :- مثنوی لفظ ثانی سے بنا ہے۔ جس کے معنی دو کے ہیں۔ شاعری کی اصطلاح میں دو دو مصرعوں کے ذریعہ لکھی جانے والی ایسی نظم جس کے ہر شعر میں قافیہ ردیف بدلتا رہتا ہے۔ اسے مثنوی کہتے ہیں۔ مثنوی طویل بیانیہ نظم ہوتی ہے جس میں کوئی قصہ یا واقعہ یا کسی موضوع پر تفصیلی بات پیش کی جاتی ہے۔ مثنوی میں اشعار کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔ قدیم دور کی مثنویوں میں مافوق الفطرت عناصر کی مدد سے شاہی زندگی کے قصے بیان کئے گئے۔ اُردو کے آغاز کے بعد دکن میں کئی شاہکار مثنویاں لکھی گئیں۔ جن میں قطب مشتری اور علی نامہ وغیرہ مشہور ہیں۔ شمالی ہند کی دو شاہکار مثنویاں میر حسن کی ''سحر البیان'' اور دیا شنکر نسیم کی ''گلزار نسیم'' مشہور ہیں۔ قدیم مثنوی میں شاہی دور کے قصے بیان ہوئے ہیں۔ جدید مثنوی میں موضوعات بدلے۔ حالی نے ''بیوہ کی مناجات'' اور ''چپ کی داد'' جاں نثار اختر نے ''امن نامہ'' کیفی اعظمی نے ''خانہ جنگی اور علی سردار جعفری نے ''جمہور'' کے نام سے نئے دور کی مثنویاں لکھیں۔

جاں نثار اختر کا تعارف :- جاں نثار اختر (1914-1976) ءمشہور ترقی پسند شاعر گزرے ہیں۔ ان کی بیوی صفیہ مشہور ادیبہ تھیں۔ جاں نثار اختر نے فلموں کے گیت لکھے۔ ان کی مشہور مثنوی ''امن نامہ'' ہے جس میں اُنھوں نے ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کو پیش کرتے ہوئے لوگوں میں قومی یکجہتی کے جذبہ کو پروان چڑھایا ہے۔

مثنوی امن نامہ کا خلاصہ :- جاں نثار اختر نے مثنوی امن نامہ کے آغاز میں خدا سے دعا کی ہے کہ اے خدا تو مجھے علم کی شراب پلا تا کہ میں اپنے وطن ہندوستان کی تعریف بیان کروں۔ شاعر ہندوستانیوں کی طرف سے اپنے وطن ہندوستان' یہاں کی مٹی، یہاں کے باغوں، یہاں کی صبح وشام، یہاں کے شہروں اور گاؤں سے پیار ہے۔ ہمیں اپنی تاریخی عمارات، یہاں کی ملی جلی تہذیب سے پیار ہے۔ غرض ہمیں ہندوستان کے ذرہ ذرہ سے پیار ہے۔ اگر کوئی ہمارے پیارے وطن کی طرف غلط نگاہ ڈالے گا، اس کی آنکھیں نکال لیں گے۔ ہم اُمید کرتے ہیں کہ ہمارے وطن کے جنگل، دریا، سب سلامت رہیں۔ لوگ یہاں کے خوشحال رہیں۔ ہمالیہ پہاڑ ہماری حفاظت کرتا رہے۔ گنگا جمنا کی ندیوں سے یہاں کی خوبصورتی برقرار رہے۔ اشوک کی لاٹ گوکل کی گلیاں، کاشی کے گھاٹ، بنارس اور اودھ کی صبح وشام سب سلامت رہیں۔ ہم اُمید کرتے ہیں کہ تاج محل سورج کی کرنوں میں چمکتا رہے اور لوگوں کو محبت کی یاد دلاتا رہے۔ ایلورا اور اجنتا کے غار اپنی تہذیب کو برقرار رکھیں۔ شاعر اُمید کرتا ہے کہ ہمارے وطن میں کھیت اچھی فصلیں اُگائیں، میدان میں ہریالی لہلہاتی رہے۔ یہاں کے لوگ دیوالی اور عید کے موقع پر خوشی مناتے رہیں۔ زندگی کی بہار قائم رہے۔ لوگ آپس میں محبت سے رہیں۔ یہاں کی لڑکیاں خوشحال رہیں۔ ان کا سہاگ سلامت رہے۔ اور وہ خوشی کے گیت گاتے رہیں۔ شاعر زندگی کی بہار کی اُمید کرتے ہوئے آگے کہتا ہیکہ ہندوستان میں لوگ ٹائیگور و اقبال کے نغمے گاتے رہیں۔ پریم چند کی کہانیاں اور غالب کی غزلیں پڑھتے رہیں۔ پنجاب اور بنگال کی شان برقرار رہے۔ اس طرح شاعر ہندوستان کی عظیم تہذیبی روایات کا ذکر کرتا ہے اور کہتا ہیکہ ہندوستان میں امن برقرار رہے۔ لوگ ایک دوسرے کی خوشی وغم میں شریک ہوں۔ شاعر کو

احساس ہے کہ اگر ملک میں امن رہے گا تو ملک کی حفاظت ہوگی اور ہندوستان ترقی کرے گا۔

مرکزی خیال:- شاعر جاں نثار اختر مثنوی امن نامہ کے ذریعہ سارے ہندوستان کو امن کا پیغام دے رہے ہیں کہ ہندوستان ہمیشہ سے گنگا جمنی تہذیب کا علم بردار رہے۔ وہ چاہتا ہے کہ لوگ یہاں کی صحت مند تہذیبی روایات کو برقرار رکھیں اور سب شاد ماں رہیں۔

مختصر سوال جواب:

سوال: لفظ مثنوی کس لفظ سے بنا ہے؟

جواب: مثنوی کا لفظ تثنیہ یا ثانی سے بنا ہے۔ جس کے معنی دہرانہ یا دو کے ہیں۔ شاعری کی اصطلاح میں طویل بیانیہ نظم کو مثنوی کہتے ہیں۔ عام طور پر مثنوی میں قدیم دور کے داستانیں بیان کی جاتی ہیں۔ مثنوی کے ہر شعر میں قافیہ اور ردیف بدلتے رہتے ہیں۔

سوال: اردو کی دو مشہور مثنویوں کے نام اور شاعر کا نام لکھئے؟

جواب: اردو کی دو مشہور مثنویاں میر حسن کی سحر البیان اور دیا شنکر نسیم کی گلزار نسیم ہیں۔

سوال: جاں نثار اختر کا تعارف بیان کیجئے؟

جواب: جاں نثار اختر (1914-1976) ء مشہور ترقی پسند شاعر گزرے ہیں۔ ان کی بیوی صفیہ مشہور ادیبہ تھیں۔ جاں نثار اختر نے فلموں کے گیت لکھے۔ ان کی مشہور مثنوی ''امن نامہ'' ہے جس میں اُنھوں نے ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کو پیش کرتے ہوئے لوگوں میں قومی یکجہتی کے جذبہ کو پروان چڑھایا ہے۔

سوال: مثنوی امن نامہ میں شاعر نے ہندوستان کی کن یادگاروں کو یاد کیا ہے؟

جواب: جاں نثار اختر نے اپنی مثنوی میں ہندوستان کی تاریخی عمارتوں تاج محل، اجنتا ایلورہ کے غار، اشوکا کی لاٹ، گنگا جمنا ندیوں، کاشی متھرا گوکل کے گھاٹ، ہمالیہ پہاڑ، ہندوستان کے موسموں، تہواروں، لوگوں کے رسم ورواج اور رہن سہن کا ذکر کیا اور اس امید کا ظہار کیا کہ وطن میں امن قائم رہے اور لوگ مل جل کر رہیں۔

سوال:: مثنوی امن نامہ کا مرکزی خیال بیان کیجئے؟

جواب: شاعر جاں نثار اختر مثنوی نے اہل وطن ہندوستانیوں کو اپنی مثنوی امن نامہ میں ہندوستان کی تمام یادگاروں کی طرف توجہ دلائی اور لوگوں کو وطن کے ہر ذرے سے پیار کرنے کا سبق پڑھایا۔ اس مثنوی کے ذریعہ وہ سارے ہندوستان کو امن کا پیغام دے رہے ہیں کہ ہندوستان ہمیشہ سے گنگا جمنی تہذیب کا علم بردار رہے۔ وہ چاہتا ہے کہ لوگ یہاں کی صحت مند تہذیبی روایات کو برقرار رکھیں اور سب امن و آمان کے ساتھ خوش وخرم رہیں۔

قصیدہ درشانِ حمید الدولہ از: شیخ ابراہیم ذوق

سوال: قصیدے کی تعریف کیجئے اور اس کے اجزائے ترکیبی بیان کیجئے؟

جواب: **قصیدہ کی تعریف :-** قصیدہ عربی لفظ ''قصد'' سے مشتق ہے۔جس کے معنی ارادہ کرنے کے ہیں۔شاعری کی اصطلاح میں ارادے کے ساتھ کسی کی تعریف یا ہجو (بُرائی، مذمت) کرنے والی نظم کو قصیدہ کہتے ہیں۔قصیدہ غزل کے طرز پر لکھا جاتا ہے۔اس کے چار اجزاء ہیں۔(۱) مطلع (۲) تشبیب (۳) گریز (۴) مدعا اور دعا۔قصیدہ کا آغاز مطلع کے ساتھ ہوتا ہے۔اس کے بعد شاعر بہار یا خوبصورت منظر بیان کرتے ہوئے ماحول تیار کرتا ہے۔اُسے تشبیب کہتے ہیں۔تشبیب کے بعد شاعر ایک یا دو شعر کے ذریعہ بادشاہ کی تعریف کی طرف رُخ کرتا ہے۔اُسے گریز کہتے ہیں۔گریز کے بعد شاعر اپنا مدعا بیان کرتا ہے اور آخر میں بادشاہ کے حق میں دعائیہ اشعار کہتا ہے۔قصیدے دو قسم کے ہوتے ہیں۔(۱) مدحیہ قصیدے جس میں کسی کی تعریف کی جائے (۲) ہجویہ قصیدے جس میں کسی کی بُرائی بیان کی جائے۔زمانے کی بُرائی بیان کرنے والے قصیدے کو شہر آشوب کہتے ہیں۔

اردو قصیدے کا ارتقاء: اردو میں ابتدائی دور کے قصیدے دکن میں لکھے گئے جو مثنوی کی طرز پر ہوتے تھے۔اور ان میں اپنے پیرو مرشد کی تعریف بیان کی جاتی تھی۔قصیدہ گوئی کو فروغ شمال میں ہوا۔اور مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد دہلی میں قصیدہ گوئی کو عروج حاصل ہوا۔مرزا محمد رفیع سودا اور ذوق اردو کے اہم قصیدہ نگار شاعر گذرے ہیں۔سودا کو اردو قصیدہ کا نقش اول کہا جاتا ہے۔انہوں نے قصیدے کے اجزائے ترکیبی متعین کئے۔لکھنو کے مشہور قصیدہ گو شعرا میں منیر شکوہ آبادی۔انشا اللہ خان انشاء محسن کاکوروی اور امیر مینائی اہم قصیدہ گو شاعر گذرے ہیں۔دہلی میں شیخ ابراہیم ذوق۔مومن خان مومن۔مرزا غالب۔اور داغ دہلوی اردو کے مشہور قصیدہ گو گذرے ہیں۔شاہی دور اور جاگیردارانہ نظام کے خاتمے کے بعد قصیدہ گوئی کو بھی زوال آ گیا۔چونکہ قصیدے صرف بادشاہوں کو خوش کرنے کے لئے لکھے جاتے تھے تاکہ انعام حاصل ہوتا ہم جب شاہی دور ہی ختم ہو گیا تو اس صنف کو بھی زوال آ گیا۔شاعروں نے بزرگان دین کی تعریف میں بھی شاہکار قصیدے لکھے۔قصیدے کی طرح کی ایک قسم ''سہرا'' لکھنے کا رواج بعد میں جاری رہا۔

سوال:- ذوق کے قصیدہ ''درشانِ حمید الدولہ'' کا خلاصہ لکھئے۔

جواب: **قصیدہ کی تعریف :-** قصیدہ عربی لفظ ''قصد'' سے مشتق ہے۔جس کے معنی ارادہ کرنے کے ہیں۔شاعری کی اصطلاح میں ارادے کے ساتھ کسی کی تعریف یا ہجو (بُرائی، مذمت) کرنے والی نظم کو قصیدہ کہتے ہیں۔قصیدہ غزل کے طرز پر لکھا جاتا ہے۔اس کے چار اجزاء ہیں۔(۱) مطلع (۲) تشبیب (۳) گریز (۴) مدعا اور دعا۔قصیدہ کا آغاز مطلع کے ساتھ ہوتا ہے۔اس کے بعد شاعر بہار یا خوبصورت منظر بیان کرتے ہوئے ماحول تیار کرتا ہے۔اُسے تشبیب کہتے ہیں۔تشبیب کے بعد شاعر ایک یا دو شعر کے ذریعہ بادشاہ کی تعریف کی طرف رُخ کرتا ہے۔اُسے گریز کہتے ہیں۔گریز کے بعد شاعر اپنا مدعا بیان کرتا ہے اور آخر میں بادشاہ کے حق میں دعائیہ اشعار کہتا ہے۔قصیدے دو

قسم کے ہوتے ہیں۔(۱) مدحیہ قصیدے جس میں کسی کی تعریف کی جائے (۲) ہجویہ قصیدے جس میں کسی کی بُرائی بیان کی جائے۔ زمانے کی بُرائی بیان کرنے والے قصیدے کو شہر آشوب کہتے ہیں۔ اُردو میں ذوق، سوداؔ، مومنؔ، غالبؔ، داغؔ وغیرہ مشہور قصیدہ گو شاعر گزرے ہیں۔ شاہی دور کے خاتمے کے بعد قصیدہ گوئی کو بھی زوال آ گیا۔

ذوقؔ کا تعارف:- شیخ ابراہیم ذوقؔ (1789-1854) اُردو کے مشہور قصیدہ گو شاعر گزرے ہیں۔ بہادر شاہ ظفر کے استاد تھے۔ اکبر شاہ ثانی نے اُنھیں ''خاقانی ہند'' کا خطاب دیا تھا۔ ان کے قصیدوں میں شوکت الفاظ بلند خیالی اور اعلیٰ مضامین ملتے ہیں۔ نصابی کتب میں شامل قصیدہ عید کے موقع پر نواب حمید الدولہ کی تعریف میں لکھا گیا ہے۔ قصیدہ کے آخر میں قصیدے کا جُز مدعا یا حسن طلب اہم ہے۔ ذیل میں قصیدے کا خلاصہ پیش کیا جا رہا ہے۔

خلاصہ قصیدہ:- شاعر ذوقؔ عید کے دن کی رونقیں اور مسرتیں بیان کرتے ہوئے قصیدے کے آغاز میں کہتے ہیں کہ آج عید کا دن ہے۔ اس دن لوگ خوشی مناتے ہیں۔ عیش و عشرت کا اظہار کرتے ہیں۔ عید کے پُر مسرت موقع پر رشتہ دار، دوست اقارب دیگر مسلمان ایک دوسرے سے گلے ملتے ہیں۔ خاص طور سے دوست احباب کے گھر جاتے ہیں اور عید کی ملاقات کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کو عید کی مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ یہ طریقہ اور رسم قدیم زمانے سے چلی آ رہی ہے۔ یہ وہ رسم ہے جو دلوں سے نفرت کو دور کرتی ہے اور آپسی محبت بڑھاتی ہے۔

عید کی مسرتوں کے بیان کے بعد شاعر موضوع بدلتے ہوئے اپنے ایک دوست کا حال بیان کرتے ہیں کہ جس طرح لوگوں کے سرپرست شفیق اور مہربان عزیز یا رشتہ دار ہوتے ہیں، میرے بھی ایسے ہی ایک اچھے دوست ہیں جو مزاج کے اعتبار سے نہایت شفیق اور مہربان ہیں۔ وہ میرے سچے اور جگری دوست ہیں۔ عید کے موقع پر وہ میرے گھر آئے۔ میں خدا کی کرنی اور زمانے کی اونچ نیچ کے سبب پریشان حال تھا۔ چنانچہ میرا حال دیکھ کر میرے دوست دیر تک حیران رہے اور حیرت سے کہنے لگے۔ اے ذوق تم اب تک اُسی طرح پریشان حال ہو۔ تمہارے بدن پر وہی پرانی قبا اور دوشالہ دکھائی دے رہا ہے۔ جبکہ تمہیں جاننے والے اور دوست تو ہزاروں ہیں۔ لوگ پوچھیں گے کہ تمہیں نواب کے دربار سے کیا انعام اور صلہ ملا۔ تنخواہ ملی یا نہیں۔ اپنے منصب اور مقام اور عہدے میں کچھ ترقی ہوئی یا نہیں۔ ہم مانتے ہیں کہ تم ایک درویش صفت قناعت پسند انسان ہو۔ جو ملتا ہے اس پر صبر کر کے خاموش رہتے ہو۔ لیکن یہ عید کا موقع ہے۔ نواب ہم سب کے سرپرست ہیں اور تمہارا اور ان کا تو خاص تعلق ہے۔ عید کے دن خوشی کے موقع پر سب کو انعام دیا جاتا ہے، تم بھی جا کر نواب حمید الدولہ سے اپنے احوال سناؤ۔ اپنی حقیقت انھیں بتاؤ، جب میں نے اپنے دوست کی زبانی یہ بات سنی تو میں یہ قصیدہ سن کر حمید الدولہ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔

قصیدہ کا مطلع ثانی پیش کرتے ہوئے ذوق نواب حمید الدولہ کی تعریف کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ اگر آپ اپنے فیض کا دریا اس دنیا میں بہا دیں گے تو اس سے ہر طرف خوشحالی آ جائے گی۔ غریب امیر ہو جائیں گے، ضرورت مند چین و سکون کی زندگی گزارنے لگیں گے، اے ہمارے سرپرست آپ کی دانائی کی تعریف جتنی بھی کی جائے کم ہے۔ آپ کی دانائی کی تعریف انگریز بھی کرتے ہیں۔ آپ چالاکی اور ہوشیاری میں بھی سب سے آگے ہیں اور لوگوں کے ساتھ ہمدردی اور خیر خواہی کرنے میں سرفہرست ہیں۔ آپ کی خوبیاں بے شمار ہیں۔ آپ کی ملک و دولت بے پناہ ہے۔ دین کے معاملے میں بھی آپ جیسا پارسا نہیں۔ آپ دانش مند ہیں، عالموں نے علم کے بارے میں جو کچھ کتابوں میں لکھا، آپ کی زندگی اسی علم کی عملی تفسیر ہے۔ آپ کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ میری زبان اور میرا قلم

آپ کی حقیقی تعریف کرنے سے قاصر ہے۔لیکن میں ہردم آپ کے حق میں دل سے یہ دعا کرتا رہتا ہوں کہ یہ عید آپ کو مبارک ہو۔آپ کی خوشیوں اور دولت میں اضافہ ہو اور آپ کی مہربانی سے میری مراد بر آئے۔میں آپ سے مدد، انعام اور صلے کا خواہش مند ہوں آپ مجھے اس قدر نوازیئے کہ میری زندگی کے تمام مسائل حل ہو جائیں اور میں خوشحال زندگی بسر کرسکوں۔اس طرح قصیدے کا اختتام عمل میں آتا ہے۔

یہ انسان کی فطرت ہے کہ اگر اسے کسی سے مدد طلب کرنا ہو تو سامنے والے کی تعریف کی جاتی ہے۔تاکہ سامنے والا اپنی تعریف سُن کر خوش ہو جائے اور بدلے میں مانگنے والے کو کچھ دولت انعام کے طور پر دے دے۔اسی جذبے کے تحت اُردو کے قصیدہ نگار شعراء نے اپنے عہد کے بادشاہوں اور نوابوں کی تعریف میں قصیدے لکھے۔ان قصائد میں تعریف بیان کرنے کیلئے مبالغہ آرائی سے کام لیا گیا اور جھوٹی شان بھی بیان کی گئی۔پُرشوکت الفاظ استعمال کئے گئے۔بھاری بھرکم الفاظ، تشبیہوں اور محاوروں کے ذریعہ بادشاہوں اور نوابوں کی تعریف کی گئی۔بعض شعراء نے بزرگانِ دین کی تعریف میں بھی قصائد لکھے۔اس طرح ذوقؔ کا یہ قصیدہ بھی نواب کی تعریف کیلئے اہمیت رکھتا ہے۔

مرکزی خیال:- ذوقؔ نے اس قصیدہ ''درشانِ حمیدالدولہ'' کے پہلے حصہ میں اپنی غربت اور دوست کی نصیحت کا ذکر کیا اور دوسرے حصے میں نواب حمیدالدولہ کی تعریف کے بعد اُن سے انعام کی درخواست کی۔یہ قصیدہ اپنے سادہ انداز بیان کیلئے اہم ہے۔

سوال:-ذوق کی قصیدہ نگاری پر نوٹ لکھئے؟

جواب: شیخ ابراہیم ذوقؔ (1789-1854) اُردو کے مشہور قصیدہ گو شاعر گزرے ہیں۔بہادر شاہ ظفر کے استاد تھے۔ذوقؔ ایک غریب سپاہی شیخ محمد رمضان کے بیٹے تھے۔ان کی ابتدائی تعلیم حافظ غلام رسول کے ہاں ہوئی۔حافظ صاحب شاعر تھے۔ان کے یہاں شعری محفلیں جمی رہتی تھیں۔ذوقؔ بھی ان میں شریک رہتے اور وہ ماحول کے اثر سے کم عمری میں شعر کہنے لگے تھے۔ابتداء میں اپنے استاد حافظ غلام رسول کو کلام دکھایا۔بعد میں مشہور شاعر شاہ نصیر سے اصلاح لی۔استاد نے محسوس کیا کہ ذوقؔ کہیں ان سے آگے نہ نکل جائیں اس لئے حوصلہ شکنی کی۔ ذوقؔ نے ان سے علٰحیدگی اختیار کرلی۔بیس سال کی عمر میں وہ بہادر شاہ ظفر کے استاد بنے۔اکبر شاہ ثانی نے اُنھیں ''خاقانی ہند'' کا خطاب دیا تھا۔اور ملک الشعراء بنایا۔

ذوقؔ کے دیوان میں غزلوں کے علاوہ بلند پائے کے قصیدے ملتے ہیں۔جو انہوں نے بادشاہوں کی تعریف میں لکھے تھے۔اردو قصیدہ نگاری میں سوداؔ کے بعد ان کا ہی مقام ہے۔انہوں نے اپنے قصیدوں میں پرشکوہ اور بھاری بھرکم الفاظ استعمال کئے۔انہیں عربی اور فارسی پر عبور تھا جس کی وجہ سے انہیں زبان و بیان پر قدرت حاصل تھی۔علمی اصطلاحات کو بھی انہوں نے خوب استعمال کیا۔مشکل زمینوں اور سنگلاخ زمینوں میں بھی انہوں نے اچھے قصیدے کہے ہیں۔لیکن سوداؔ کی سی خلاقانہ صلاحیت؛ زور بیان اور بلندیٔ تخیل ان کے یہاں نہیں ہے۔انہوں نے اشعار میں محاروں اور کہاوتوں کو بھی پیش کیا۔لیکن ان کی کثرت سے کبھی شاعری کا حسن ماند پڑتا ہے۔پند و نصیحت کی باتیں بھی ان کے کلام میں ملتی ہیں۔اس طرح ذوقؔ سوداؔ کے بعد اردو کے مشہور قصیدہ گو کے طور پر جانے جاتے ہیں۔

مختصر سوال جواب:

سوال: قصیدے کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں؟

جواب: قصیدہ عربی لفظ ''قصد'' سے مشتق ہے۔جس کے معنی ارادہ کرنے کے ہیں۔شاعری کی اصطلاح میں ارادے کے ساتھ کسی کی تعریف

یا ہجو (بُرائی، مذمت) کرنے والی نظم کو قصیدہ کہتے ہیں۔قصیدہ غزل کے طرز پر لکھا جاتا ہے۔اس کے چار اجزاء ہیں۔(۱) مطلع (۲) تشبیب (۳) گریز (۴) مدعا اور دعا۔

سوال: قصیدے کتنے قسم کے ہوتے ہیں؟

جواب: قصیدے دو قسم کے ہوتے ہیں۔۱) مدحیہ قصیدہ جس میں کسی بادشاہ، امیر یا بزرگ کی تعریف کی جاتی ہے۔۲) ہجویہ قصیدہ۔جس میں زمانے کی بدحالی کا بیان ہوتا ہے یا کسی کی برائی بیان کی جاتی ہے۔

سوال: اردو کے اہم قصیدہ نگاروں کے نام لکھو؟

جواب: لکھنؤ کے مشہور قصیدہ گو شعرا میں منیر شکوہ آبادی۔انشا اللہ خان انشاء، محسن کاکوروی اور امیر مینائی اہم قصیدہ گو شاعر گذرے ہیں۔دہلی میں شیخ ابراہیم ذوق۔مومن خان مومن۔مرزا غالب۔اور داغ دہلوی اردو کے مشہور قصیدہ گو گذرے ہیں۔

سوال: ذوقؔ کس بادشاہ کے استاد تھے اور انہیں کیا خطاب دیا گیا؟

جواب: ذوقؔ مغل حکمران بہادر شاہ ظفر کے استاد تھے۔اور انہیں خاقانیء ہند کا خطاب دیا گیا۔

سوال: نصابی کتاب میں شامل قصیدہ کس کی تعریف میں لکھا گیا؟

جواب: نصابی کتاب میں شامل قصیدہ ''حمید الدولہ'' نواب کی تعریف میں لکھا گیا۔

سوال: قصیدہ ''درشان حمید الدولہ'' کا مرکزی خیال کیا ہے؟

جواب: ذوقؔ نے اس قصیدہ ''درشانِ حمید الدولہ'' کے پہلے حصہ میں اپنی غربت اور دوست کی نصیحت کا ذکر کیا اور دوسرے حصے میں عید کے موقع پر نواب حمید الدولہ کی تعریف کی ہے اور اُن سے انعام کی درخواست کی۔یہ قصیدہ اپنے سادہ انداز بیان کیلئے اہم ہے۔

مرثیہ گرمی کا سماں از: میر انیسؔ

سوال: مرثیے کی تعریف کیجئے اردو میں مرثیہ نگاری کا ارتقاء بیان کیجئے؟

مرثیہ :-

مرثیہ عربی لفظ رثاء یا رثٰی سے مشتق ہے۔جس کے لغوی معنی میت پر رونے کے ہیں مگر اصطلاحی حیثیت سے یہ لفظ عربی میں شاعری کی اس صنف کیلئے استعمال ہوا ہے۔جس میں کسی عزیز یا محبوب کی موت پر رنج وغم کے ساتھ مرحوم کی صفات کے بیان پر زور دیا جاتا ہے۔اُردو میں مرثیے کی اصطلاح فارسی کے توسط سے پہنچی ہے۔اس کی دو قسمیں ہیں۔ایک تو شخصی مرثیہ اور دوسرا کربلائی مرثیہ۔ شخصی مرثیوں کیلئے کوئی ہیت مقرر نہیں ہے۔یہ غزل، ترکیب بند، مسدس، یا پھر کسی اور ہیت میں لکھے گئے ہیں۔مرزا غالبؔ نے اپنی محبوبہ اور بھانجے عارفؔ کے مرثیے غزل کی ہیت میں لکھے ہیں۔اُردو میں شخصی مرثیوں کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے۔

فارسی میں کربلائی مرثیے نے شخصی مرثیے کی کوکھ سے جنم لیا۔یہ حضرت امام حسینؓ اور اہل بیت واصحاب کی شہادت کے بیان

کیلئے مخصوص ہے۔کربلائی مرثیوں کا فارسی شاعری میں بڑا عروج ہوا۔اُردو میں کربلائی مرثیوں کیلئے ابتداء میں کوئی ہیت مقرر نہیں تھی۔ابتدائی دور میں ان مرثیوں کیلئے غزل کی ہیت زیادہ مقبول تھی۔غزل کے بعد مربع کی شکل زیادہ پسند کی گئی۔مربع کے علاوہ مثلث، مخمس، مسدس، مثمن اور مثنوی کی ہیت میں بھی کربلائی مرثیے لکھے گئے۔سوداؔ اور میرؔ ضمیر نے کربلائی مرثیوں کیلئے مسدس کی ہیت کو فروغ دیا اور یہ ہیت ان مرثیوں کیلئے مخصوص ہوگئی اور بعد میں رزمیہ نظم کی شکل اختیار کرلی۔مرثیے کے اجزائے ترکیبی حسب ذیل ہیں۔

﴿چہرہ﴾ ماجرا ﴿سراپا﴾ رخصت ﴿آمد﴾ رجز ﴿جنگ﴾ شہادت اور ﴿بین

چہرہ میں تمہید کے طور پر ایسے مضامین شامل کئے جاتے ہیں۔جن کا مرکزی کردار سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہوتا۔جیسے موسم یا کسی منظر کی تصویر کشی، دنیا کی بے ثباتی یا شاعرانہ تعلّی کا تذکرہ ماجرا میں ایسے واقعات کا ذکر ہوتا ہے۔جس کا مقصد چہرہ سے گریز کرکے مرکزی کردار تک آنا ہوتا ہے۔کسی ایک مرثیہ میں چہرہ، ماجرا، رخصت، آمد، سراپا، رجز، جنگ، شہادت اور بین کا ہونا ضروری نہیں۔انیس و دبیر وغیرہ نے محض مصائب کا بیان کیا ہے۔

واقعہ کربلا کے کئی سو سال بعد صفوی دور میں فارسی شعرائنے مذہبی عقیدت کی بنا پر مرثیہ نگاری شروع کی جن میں محتشم کا نام سرفہرست ہے اردو کے دکنی دور میں بے شمار مرثیے لکھے گئے شمالی ہند میں بھی اردو شاعری کے فروغ کے ساتھ ساتھ مرثیہ گوئی کا آغاز ہوا۔لیکن سودا سے پہلے جتنے مرثیے لکھے گئے ان کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔سودا پہلے شاعر ہیں جنہوں نے اس کو فنی عظمت عطا کی اور مرثیے کے لئے مسدس کو مخصوص کردیا جس کو بعد کے شعرائنے بھی قائم رکھا۔سودا کے بعد میر خلیق، میر ضمیر، دیگر اور فصیح وغیرہ نے مرثیہ کو ترقی دی لیکن فنی بلندی، امتیازی خصوصیات کو نکھارنے اور جاذب دل و دماغ بنانے کے لئے ااس صنف کو میر انیس کی ضرورت تھی جنہوں نے مرثیہ کو معراج کمال پر پہنچایا انیس نے جس خاندان میں آنکھ کھولی اس میں شعروشاعری کا چرچا تھا۔اور وہ کئی پشت سے اردو ادب کی خدمت کررہا تھا۔علاوہ دوسرے اصناف کے مرثیے میں طبع آزمائی کی جارہی تھی۔میر ضاحک، میر حسن اور میر خلیق اپنے وقت کے ممتاز مرثیہ نگار تھے۔الفاظ زبان کی صفائی، اور صحت پر خاص زور تھا۔انیس نے جس وقت مرثیے کی دنیا میں قدم رکھا اس وقت لکھنو میں لفظی اور تصنع پر زیادہ زور تھا اس ماحول میں انیس نے مرثیہ گوئی شروع کی اور دہلی والوں کی اس کہاوت کو غلط ثابت کردیا کہ ''بگڑا شاعر مرثیہ گو''

عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں　　پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں

مرثیے میں میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ نے جو شہرت پائی وہ کسی اور کے حصہ میں نہ آسکی عصر جدید کے مرثیہ گو شعراء میں جوش ملیح آبادی، شادؔ عظیم آبادی، جمیل مظہری صفدر حسین، آلِ رضا، اور ڈاکٹر وحید اختر کے نام بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔

سوال: انیسؔ کے مرثیے ''گرمی کا سماں'' کا خلاصہ لکھئے۔

جواب: مرثیہ:- لفظ مرثیہ عربی لفظ رثا سے بنا ہے۔جس کے معنی کسی کی موت پر بین کرتے ہوئے رونے کے ہیں۔شاعری کی اصطلاح میں ایسی نظم جس میں کسی مرنے والے کے اوصاف بیان کرتے ہوئے غم کے جذبات کا اظہار کیا جاتا ہے۔اسے مرثیہ کہتے ہیں۔مرثیے دو قسم کے ہوتے ہیں۔(۱) شخصی مرثیہ: جس میں کسی بھی شخص کی موت پر اظہار غم کیا جاتا ہے۔

(۲) کربلائی مرثیہ: جس میں واقعات کربلا امام حسینؓ اوران ساتھیوں کی شہادت کو بیان کیا جاتا ہے۔ کربلائی مرثیہ کے اجزائے ترکیبی میں چہرہ، سراپا، رخصت، آمد، رجز، جنگ شہادت بین اور دعا شامل ہیں۔ اُردو میں مرثیہ نگاری کی روایت عربی اور فارسی سے شروع ہوئی۔ دکنی ادب میں کئی مرثیہ لکھے گئے۔ شمالی ہند میں لکھنو میں مرثیہ نگاری کو فروغ ملا۔ انیسؔ اور دبیرؔ مشہور مرثیہ گو شاعر گزرے ہیں۔

انیسؔ کے حالات زندگی :- میر ببر علی انیسؔ (1801-1874) اُردو کے مشہور مرثیہ گو شاعر گزرے ہیں۔ فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ انیسؔ کو لفظوں کا جوہری کہا جاتا ہے۔ ان کے مرثیے جذبات نگاری، منظر نگاری، کردار نگاری اور اپنے انداز بیان کیلئے مشہور ہیں۔ انیسؔ نے اپنے اک مرثیے میں کربلا کی جنگ کے دن میدان جنگ میں گرمی کا حال جذباتی انداز میں بیان کیا ہے۔ مرثیہ کے اس حصہ کا خلاصہ اس طرح ہے۔

خلاصہ :- انیسؔ نے مرثیہ کے اس حصہ میں کربلا کی جنگ کا منظر بیان کیا ہے اور خاص طور سے اُس دن ہونے والی شدید گرمی کو کئی مثالوں اور تشبیہوں سے شاعرانہ نزاکت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ انیسؔ اس دوران اپنے بیان میں غلو کر جاتے ہیں۔ کبھی جھوٹ بھی بولتے ہیں لیکن ان کا مقصد یہ ظاہر کرنا تھا کہ حق کیلئے لڑتے ہوئے امام حسینؓ اوران کے جاں نثار ساتھیوں نے کس طرح کربلا کی سخت گرمی میں جنگ لڑی۔ چنانچہ انیسؔ کہتے ہیں کہ جنگ کے دن گرمی اس قدر شدید تھی کہ گرمی کے بیان سے زبان جل جانے کا ڈر تھا۔ میدان جنگ میں شدید لو اور گرمی تھی۔ ایسی گرمی سے اللہ ہی کسی کی حفاظت کرسکتا ہے۔ گرمی کے سبب میدان جنگ اور آسمان دونوں سرخ ہوگئے۔ لوگ زمین پر ٹھنڈی ہوا کو ترسنے لگے۔ ایسا لگتا تھا کہ گرم ہوا کے سبب زمین پر آگ برس رہی ہے۔ دریائے فرات میں جو جانور تھے وہ گرمی کے سبب اپنا منہ باہر نہیں نکالتے تھے۔ جنگل میں پرندے چھاؤں کی تلاش میں اِدھر اُدھر چھپ رہے تھے۔ لوگ خس لگا کر ٹھنڈک کا انتظار کر رہے تھے۔ گرمی اس قدر شدید تھی کہ اگر باہر نظر پڑ جائے تو ان کی آنکھوں میں چھالے پڑ جائیں۔ ایسی شدید گرمی میں واقعہ کربلا کی یہ خیر و شر کی جنگ لڑی گئی۔

انیسؔ جنگ کے دن گرمی کا بیان جاری رکھتے ہوئے لکھتے ہیں کہ گرمی کے سبب شیر کچھار سے اور ہرن سبزے سے باہر نہیں نکلتے تھے۔ سورج دھول کے سبب واضح دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ گرمی کے سبب ہوا بھی تپ رہی تھی۔ زمین اس قدر گرم تھی کہ اگر زمین پر کوئی دانا گر جاتا تو وہ بھی بھن جاتا تھا۔ مرثیے کے اگلے بند میں انیسؔ کہتے ہیں کہ گرمی کی شدت کے سبب اس وقت ایسا لگتا تھا کہ آسمان پر شعلے برس رہے ہیں۔ پانی سے شعلے اور چنگاریاں نکل رہی ہوں اور پانی سے اُبھرنے والے بلبلے بھی انگار کی طرح گرم تھے۔ پانی کی یہ صفت ہوتی ہے کہ گرمی کے دنوں میں کنویں اور دریا کا پانی شدید گرمی میں ٹھنڈا ہوجاتا ہے لیکن انیسؔ کو میدان کربلا کی گرمی کی شدت بیان کرنا تھا۔ اس لئے وہ شاعری میں استعمال ہونے والی مبالغہ آرائی کی گنجائش کو استعمال کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ گرمی کی شدت سے دریائے فرات کا پانی اور اس کے بلبلے بھی گرم ہوگئے تھے۔ اور حقیقت میں یہ بات غلط ہے لیکن انیسؔ موقع کی شدت کا اُجاگر کرنے کے لئے اس طرح کی مبالغہ آرائی سے کام لیتے ہیں۔ چنانچہ گرمی کی شدت کے بیان میں انیسؔ آگے کہتے ہیں کہ گرمی کی شدت کے سبب اُٹھنے والی پانی کی لہروں کو دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ کوئی پیاسا جانور اپنی زبان باہر نکالے ہانپ رہا ہو۔ دریائی جانور سب پانی کی تہہ میں تھے لیکن پیاس کے سبب اُن کا بھی برا حال تھا۔ گرمی کی شدت کی انتہا بیان کرتے ہوئے انیسؔ شاعرانہ انداز میں کہتے ہیں کہ اس وقت پانی آگ کی طرح گرم تھا اور گرمی کے سبب پانی کی لہروں سے جو مچھلیاں اوپر آتی تھیں وہ شیخ کے کباب کی طرح بھُن جاتی تھیں۔ اس بند میں انیسؔ نے ہندوستانی قارئین کے ذہنوں کو مدنظر رکھتے ہوئے منظر نگاری

کی۔ورنہ حقیقت اورفطرت کا یہ اصول ہے کہ جتنی زیادہ گرمی ہوتی ہے۔دریا اور کنویں کا پانی اُتنا ہی ٹھنڈا ہوتا ہے۔اس وقت امام حسینؓ کی فوج تین دن سے پیاسی بھی تھی ان کی پیاس کی شدت کو اجاگر کرنے کے لئے بھی انیسؔ نے بھی پانی کے گرم ہوجانے کو بیان کیا ہے۔گرمی کی شدت کے بیان کو جاری رکھتے ہوئے انیسؔ نصابی کتاب میں شامل مرثیے کے آخری حصے میں کہتے ہیں کہ آسمان گرمی سے تپ رہا تھا اور وہ گرمی کی تاب برداشت نہیں کر پا رہا تھا۔بجلی جو خود اپنے اندر شدید حرارت رکھتی ہے وہ بھی اس دن کہیں چھپ جانا چاہتی تھی۔زمین اور آسمان کی ہر شے گرم ہوگئی تھی۔آسمان آگ کے گنبد میں تبدیل ہوگیا تھا۔اور اس سبب بادل بھی کہیں چھپ گئے تھے۔غرض اس دن میدان کربلا میں روز قیامت کی سی گرمی تھی۔ایسی شدید گرمی اور بھوک پیاس کے عالم میں امام حسینؓ اور ان کے اہل خاندان اور دیگر افراد نے حق اور اسلام کی سربلندی کے لئے جنگ لڑی اور اپنی جانیں قربان کیں۔ان کی قربانیاں اس قدر عظیم ہیں کہ آج بھی اس واقع کو بیان کیا جائے تو پڑھنے والے کی آنکھ سے آنسو ٹپک پڑیں۔یہی انیسؔ کی جذبات نگاری اور عام طور سے ان کی مرثیہ نگاری کا کمال ہے۔

مرکزی خیال:- انیسؔ نے مرثیے کے اس حصے میں واقعہ کربلا کے دن میدان جنگ میں ہونے والی گرمی کی شدت کو شاعرانہ انداز میں بیان کیا ہے۔انیسؔ کا مقصد لوگوں کے دلوں میں شدید غم کے جذبات پیدا کرنا تھا۔اس کے لئے انہوں نے اپنے بیان میں مبالغہ آرائی سے بھی کام لیا۔اور واقعہ کربلا کے بیان میں تاثیر پیدا کردی۔مرثیے کے اس حصے میں بہت سی باتیں حقیقت اور فطرت سے دور ہیں لیکن انیسؔ گرمی کی شدت کے بیان کے لئے مبالغہ آرائی سے کام لیتے ہیں اور بڑی فنکاری کا مظاہر کرتے ہوئے اپنی بات کو پیش کرنے میں کامیاب رہتے ہیں۔

سوال: میر انیسؔ کی مرثیہ نگاری پر نوٹ لکھو؟

جواب: میر ببر علی انیسؔ (1874-1801) اُردو کے مشہور مرثیہ گو شاعر گزرے ہیں۔فیض آباد میں پیدا ہوئے۔انیسؔ کو لفظوں کا جوہری کہا جاتا ہے۔ان کے مرثیے جذبات نگاری، منظر نگاری، کردار نگاری اور اپنے انداز بیان کیلئے مشہور ہیں۔میر انیس اُردو کے ایک ایسے شاعر ہیں جنہوں نے زمین سخن کو آسمان کردیا ہے۔جس طرح سودا قصیدہ گوئی میں میر غزل گوئی میں اور میر حسن مثنوی نگاری میں بے مثل ہیں اسی طرح میر انیس مرثیہ نگاری میں یکتا ہیں۔اوّل تو میر انیس نے اپنی مرثیوں میں بہت سے نئے موضوعات کو شامل کیا ہے۔اور اس طرح اس کے دامن کو وسیع کردیا ہے۔دوسرا انہوں نے شاعری کو مذہب سے وابستہ کرکے اس کو ارفع و اعلیٰ بنادیا ہے۔اس طرح اردو شاعری مادیت کے سنگ ریزوں سے نکل کر روحانیت کے ستاروں میں محو خرام ہوگئی ہے۔انیس کی شاعرانہ عظمت کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ انیس نے سلاموں اور مرثیوں میں وہ شاعری کی ہے جن میں بقول حالی حیرت انگیز جلوؤں کی کثرت ہے جن میں زبان پر فتح ہے جو شاعر کی قادرالکلامی جذبے کی ہر لہر اور فن کی ہر موج کی عکاسی کرسکتی ہے۔جس میں رزم کی ساری ہماہمی اور بزم کی ساری رنگینی لہجے کا اُتار چڑھاؤ اور فطرت کا ہر نقش نظر آتا ہے ان کا یہ دعویٰ کس طرح بیجا نہیں،

گلدستہ معنی کو نئے ڈھنگ سے باندھوں　　اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں

میر انیسؔ کے مرثیے منظر نگاری جذبات نگاری کردار نگاری اور دیگر خصوصیات کی وجہ سے اردو مرثیہ نگاری میں اہمیت رکھتے ہیں۔

منظر کشی:- الفاظ میں کسی جذبہ، واقعہ یا منظر کھینچا محاکات کہلاتا ہے۔محاکات کی قدرت انیس میں اس درجہ بڑھی ہوئی تھی کہ خود مرزا دبیر کے مداحوں کو میر انیس کی عظمت کو تسلیم کرنا پڑا ہے۔یہ خصوصیت ان کو (میر حسن مثنوی سحر البیان) سے ترکہ میں ملی تھی۔میر انیس کا کما

ل یہ ہے کہ جس واقعہ کو بیان کرتے ہیں اس کی تصویر کھینچ دیتے ہیں بلکہ ان کی تصویر کبھی کبھی اصل سے بھی بہتر ہو جاتی ہے۔

واقعہ نگاری: میر انیس واقعہ نگاری کے مرد میدان ہیں۔ انہوں نے واقعہ نگاری کو جس کمال کے درجہ تک پہنچایا اُردو کیا فارسی میں بھی اس کی نظیریں مشکل سے ملتی ہیں۔ میر انیس کی نگاہوں سے دقیق اور چھوٹے سے چھوٹا نکتہ بھی نہیں بچتا۔ مثلاً ایک موقعے پر گھوڑے کی تیز روی کو لکھا ہے جب حد سے زیادہ تیز دوڑتا ہے تو اُس کی دونوں کنوتیاں کھڑی ہوں کر مل جاتی ہیں۔

کردار نگاری:۔ ڈرامہ کی طرح مرثیہ میں بھی کردار نگاری کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ مرثیے کے کردار مثالی ہوتے ہیں۔ جیسے امام حسین اور ان کے ساتھی حق وصداقت کے علم بردار اور یزیدی لشکر باطل کا پیروکار۔ انیس کے کردار زندہ اور متحرک ہوتے ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے مرثیہ کا کردار سامع کا قریبی آدمی ہے۔ میر انیس کردار سیرت، عمر اور مرتبے میں بڑی رعایت رکھتے ہیں

تصادم و کشمکش:۔ میر انیس اکثر اپنے مرثیوں میں ڈرامائی کیفیت پیدا کرتے ہیں اور اس کیفیت کی کشمکش بہت زوردار ہوتی ہے۔ مثلاً انیس کے ایک مشہور مرثیہ ''بخدا فارس میدان تہور تھا حر'' میں ڈرامائی تصادم کی بہت اچھی مثالیں ملتی ہیں۔ اس میں خیر و شر کی قوتوں کا ٹکراؤ ڈرامہ اور مکالمات کی صورت میں سامنے آتا ہے۔

اخلاقی شاعری:۔ انیس نے تمام کلام میں بلند اخلاقی لہر دوڑائی ہوئی ہے۔ جن اخلاق فاضلہ کی تعلیم انیس نے دی ہے وہ کسی اور جگہ نہیں ملتی۔ انہوں نے نفسِ انسانی کے انتہائی شرافت کے نقشے جن موثر طریقوں سے کھینچے ہیں ان کا جواب ممکن نہیں۔

فصاحت و بلاغت:۔ میر انیس کے کلام کی ایک بڑی خصوصیت ان کی فصاحت و بلاغت ہے میر انیس نے اردو شعراء میں سب سے زیادہ الفاظ استعمال کئے ہیں۔ مگر ان کے ہاں غیر فصیح الفاظ کا ملنا مشکل ہے اور یہی وہ خصوصیت ہے جو ان کو تمام دوسرے مرثیہ گو شعراء سے اور خود مرزا دبیر سے بھی یقیناً ممتاز اور نمایاں کرتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ بیان کا حسن اور طرزِ ادا کی خوبی اس درجہ موجود ہے کہ وہ اردو ادب میں آج بھی اپنا حریف تلاش کر رہی ہے۔ خود وہ حضرات بھی جو مرزا دبیر کے کلام کے مداح ہیں اس بات کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ انیس کے یہاں دبیر سے زیادہ فصاحت و بلاغت اور حسنِ بیان موجود ہے۔ ان خصوصیات کی مثال ان کا پورا کلام ہے' ان کا کلام فصیح و بلیغ ہے۔ زبان صحیح اور روزمرہ بڑی خوبی سے استعمال کیا ہے۔ انتخاب الفاظ مضمون اور موضوع کے لحاظ سے ہوتا ہے۔ جزئیات نگاری میں اُستادانہ مہارت، جذبات کے بیان کا خاص سلیقہ، منظر نگاری اور مظاہر قدرت کے بیان میں زور تشبیہات اور استعارات میں جدت اور ندرت ہے۔ انیس کے مرثیے رزمیہ شاعری کے شہ کار ہیں۔ مناظر قدرت کے بیان انسانی جذبات کی مصوری اور رزم آرائی میں انہوں نے حیرت انگیز واقفیت کا ثبوت دیا ہے۔ فنی مہارت بلند تخیل اور مضمون آفرینی کی اس سے بہتر مثال کہیں اور نہیں ملتی۔ انیس کے مرثیوں میں مبالغہ بھی ہے اور تکلف و تصنع بھی۔ لیکن ایک تو ان چیزوں میں اعتدال ہے دوسرے ان کی شعری خوبیوں نے ان سب پر ایسا پردہ ڈال دیا ہے کہ یہ چیزیں عیب کی جگہ حسن بن گئیں ہیں۔ ادب اردو میں انیس ایک خاص مرتبہ رکھتے ہیں بحیثیت شاعر کے ان کی جگہ صف اولین میں ہے اور بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو ان کو زبان اردو کے تمام شعراء سے بہترین اور کامل ترین سمجھتے ہیں اور ان کو ہندوستان کا شکسپیر اور خدائے سخن اور نظم اردو کا ہومر اور ورجل اور بالمیک خیال کرتے ہیں۔

مختصر سوال جواب:

سوال: مرثیہ کس قسم کی نظم کو کہتے ہیں۔

جواب: مرثیہ اس نظم کو کہتے ہیں جس میں کسی کی موت پر اس کے اوصاف بیان کرتے ہوئے اظہار غم کیا جاتا ہے۔ تاہم شاعری کی اصطلاح میں واقعات کربلا کے بیان کے لئے لکھی جانے والی نظم کو مرثیہ کہتے ہیں۔ مرثیے دو قسم کے ہوتے ہیں کربلائی مرثیے۔ شخصی مرثیے۔

سوال: میر انیسؔ کا مختصر تعارف بیان کیجئے۔

جواب: میر ببر علی انیسؔ (1801-1874) اُردو کے مشہور مرثیہ گو شاعر گزرے ہیں۔ فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے مرثیہ نگاری کے فن کو کمال تک پہونچایا۔ انیسؔ کو لفظوں کا جوہری کہا جاتا ہے۔ ان کے مرثیے جذبات نگاری، منظر نگاری، کردار نگاری اور اپنے انداز بیان کیلئے مشہور ہیں۔

قطعات

قطعہ کی تعریف:- قطع کے لغوی معنی ٹکڑے یا کاٹے ہوئے حصہ کے ہیں۔ شاعری کی اصطلاح میں قطع دو یا دو سے زائد ایسے اشعار کو کہتے ہیں جس میں بات بیان کی جاتی ہے۔ غزل یا قصیدہ میں جب ایک شعر میں بات مکمل نہیں ہوتی ہے تو شاعر ایک سے زائد اشعار میں بات مکمل کرتا تھا۔ بعد میں صنف کے طور پر بھی قطعات لکھے جانے لگے۔ اس میں قافیہ ردیف کی پابندی ہوتی ہے۔

قطعہ اکبر الہ آبادی

چھوڑ لٹریچر کو اپنی ہسٹری کو بھول جا
شیخ و مسجد سے تعلق ترک کر اسکول جا
چار دن کی زندگی ہے، کوفت سے کیا فائدہ
کھا ڈبل روٹی، کلرکی کر، خوشی سے پھول جا

اکبرؔ کا تعارف:- اکبر حسین اکبرؔ الہ آبادی (1846-1921) طنز و مزاح کے بڑے شاعر گزرے ہیں۔ اُنھوں نے اسلامی تہذیب کی حفاظت پر زور دیا اور انگریزی تہذیب اختیار کرنے والے مسلمانوں کو طنز کا نشانہ بنایا۔ اُن کے ایک قطعہ کا خلاصہ اس طرح ہے۔

خلاصہ قطعہ:- اکبر انگریزی تہذیب اختیار کرنے والے مسلمانوں پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ لوگ اپنے ماضی کو بھلا بیٹھے ہیں اور اپنے شاندار ادب کی روایات کو چھوڑ چکے ہیں۔ تہذیب و اخلاق ہماری نشانی رہی۔ ہمارے اسلامی احباب ہماری شناخت رہے لیکن مغربی تہذیب کی یلغار سے سب کچھ بگڑ گیا۔ آج کے نوجوان اپنے ماضی کو بھلا کر انگریزی تہذیب کے دل دادہ ہوگئے۔ وہ بزرگوں کی صحبت میں بیٹھ کر اچھی باتیں سیکھنا نہیں چاہتے اور نہ ہی مسجد سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور نہ سیدھے راستے پر چلنا چاہتے ہیں۔ اکبر ایسے لوگوں پر طنز کرتے

ہوئے کہتے ہیں کہ اب یہ تو اسکول جائیں گے۔ جہاں انگریزی بول چال کے ساتھ انگریزی تہذیب سیکھیں گے۔ ایسے لوگوں کو خدا کا خوف نہیں ہوتا اور نہ ہی آخرت کے حساب کتاب کا ڈر۔ وہ اس دنیا کو جنت سمجھتے ہیں اور یہاں ملنے والے عارضی چین وسکون سے ہی مطمئن ہیں۔ ایسے لوگ ڈبل روٹی کھاتے ہیں اور کوٹ پہن کر خوش رہتے ہیں۔ جو کہ مغربی تہذیب کی نشانیاں ہیں۔

مرکزی خیال :- اکبر مغربی تہذیب پر جان دینے والوں کی صفات بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ لوگ اسلام کے شاندار ماضی کو بھلا بیٹھے ہیں اور انگریزی تہذیب کی ظاہری چمک دمک سے خوش ہیں۔ یہ ان لوگوں کا دھوکہ ہے۔

سوال: اکبر الہ آبادی کی شاعری پر نوٹ لکھو؟

جواب: **اکبر کا تعارف :-** اکبر حسین اکبر الہ آبادی (1846-1921) طنز و مزاح کے بڑے شاعر گزرے ہیں۔ اُنھوں نے اسلامی تہذیب کی حفاظت پر زور دیا اور انگریزی تہذیب اختیار کرنے والے مسلمانوں کو طنز کا نشانہ بنایا۔ اکبر کی شخصیت اور آرٹ کو سمجھنے کیلئے ہمیں اکبر کا زمانہ دیکھنا ہوگا۔ غربت میں ترقی کرتے ہوئے انہوں نے عدالت کے جج کے عہدے تک ترقی کی۔ انگریزی تہذیب کو قریب سے دیکھا۔ مزاحیہ شاعری کو اپنایا۔ آتش کے شاگرد تھے۔ اکبر ایک فطری شاعر تھے۔ بچپن سے شعر کہنے لگے تھے۔ اس زمانے کے مشہور شاعر غلام وحید سے اصلاح لیتے تھے۔ اکبر نے اپنی شاعری کی ابتداء روایتی طرز کی غزل گوئی سے کی۔ ان کے ابتدائی کلام میں رنگینی، شوخی اور روایتی لب ولہجہ میں ہجر و وصال کا بیان ہے۔ زبان کا چٹخارہ، روایت لفظی کا اہتمام اور دور از کار تشبیہات کا استعمال ان کے کلام میں دکھائی دیتا ہے۔ اودھ پنچ کی طنز و مزاح کی تحریک کے آغاز کے ساتھ اکبر مزاحیہ شاعری کرنے لگے۔ اکبر نے اس دور میں آنکھ کھولی تھی جب ہندوستانیوں کو اپنے مذہب اور مشرقی تہذیب سے پیار تھا۔ لیکن انگریزوں کی ہندوستان میں آمد اور 1857ء کے بعد سرسید کی جانب سے انگریزی تعلیم کے حصول پر زور دینے کے بعد مسلمان اور دیگر ہندوستانی انگریزی تہذیب کو اپنانے لگے تھے۔ اکبر اردو میں طنز و مزاح کے نمائندہ شاعر ہیں۔ کلیات اکبر پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے غزل، نظم، رباعی، قطعات اور کئی متفرق اشعار پر مبنی اپنی طنز و مزاح اور سنجیدہ شاعری کو پیش کیا ہے۔

اکبر نے اپنی شاعری کے ذریعہ اس خدشے کا اظہار کیا کہ مسلمان کہیں اسلامی قدروں سے دور نہ ہو جائیں۔ انہیں یہ اندازہ نہیں تھا کہ انگریزی تعلیم مسلمانوں کی معاشی تنگی دور کریگی۔ ان کی شاعری میں رعائت لفظی ملتی ہے۔ اکبر کی شاعری میں 1884ء سے 1912ء تک بلندی نظر آتی ہے۔ بعد میں وہ صوفی اور اللہ والے بن گئے تھے۔ اکبر نے زندگی کی نئی باتوں کا مذاق اڑایا اپنی ظرافت کے ذریعہ انہوں نے سماجی اصلاح کی کوشش کی لیکن اس میں انہیں زیادہ کامیابی نہیں ملی۔ اکبر بے پردگی کے خلاف تھے لیکن انہیں لوگوں کو ہم خیال بنانے میں زیادہ کامیابی نہیں ملی۔ اسی لئے وہ کہتے ہیں۔

غریب اکبر نے بحث پردے کی، کی بہت کچھ مگر ہوا کیا
نقاب الٹ ہی دی اس نے کہہ کر کہ کر ہی لے گا مگر ہوا کیا

اس دور میں لڑکیوں کی تعلیم کے نام پر بے پردگی، مردوں کی مجلسوں میں عورتوں کی شرکت، مغربی لباس، مغربی طرز کی دعوتیں، کلب ناچ گھر وغیرہ میں مسلمان گھرنے لگے تھے۔ اکبر نے لڑکیوں کی بے پردگی پر چوٹ کرتے ہوئے اپنا یہ مشہور قطعہ کہا۔

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں
اکبر زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو ان سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا
کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

لیکن اسکا مطلب نہیں کہ اکبر کی طنز وظرافت بیکار گئی۔ اکبر کی کوشش کی وجہہ سے مغربی تہذیب پر ردعمل شروع ہوا۔ اکبر اپنے زمانے کے بہاؤ کو نہیں روک سکے۔ لیکن انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ آنے والی نسلوں کو چوکنا کر دیا۔ سرور کہتے ہیں کہ اکبر بڑے ہنسوڑ تھے۔ انہیں واقعہ کا مضحک پہلو بہت جلد نظر آتا تھا عام خیال کو الٹ پلٹ کر نیا رنگ دیتے تھے۔

؎ عاشقی کا ہو برا' اس نے بگاڑے سارے کام
ہم تو AB میں رہے' اغیار BA ہو گئے

اکبر نے اپنی شاعری میں واعظ کا مزاق اڑایا۔ لیڈروں کی پول کھولی۔ انگریزی تعلیم کا مذاق اڑایا۔ انگریزی تہذیب کے بارے میں ان کا یہ شعر بہت مشہور ہوا۔

؎ بوٹ ڈاسن نے بنایا میں نے ایک مضمون لکھا
ملک میں مضمون نہ پھیلا اور جوتا چل گیا

اکبر نے اپنی شاعری میں لفظوں کو بڑی خوبی سے استعمال کیا ہے۔ اکبر کہتے ہیں۔

؎ اکبر دبے نہیں کسی سلطان کی فوج سے
لیکن شہید ہو گئے بیگم کی فوج سے

اس شعر میں اکبر نے اپنے تخلص کو بڑی خوبی سے بیان کیا۔ اکبر نے اپنی اردو شاعری میں انگریزی الفاظ استعمال کرتے ہوئے مزاح پیدا کیا ہے۔ اکبر کہتے ہیں۔ اکبر ایک زمانہ شناس تھے۔ ماہر نباض تھے۔ انہوں نے زمانے کی نبض دیکھ کر کھری کھری باتیں سنائیں۔ وہ نہ صرف طنز پر اکتفا کرتے ہیں۔ بلکہ ایک حاذق حکیم کی طرح مرض کا علاج بھی بتاتے ہیں۔ اپنی نظم ''تعلیم نسواں'' میں اکبر نے مشرقی اقدار کی حامل ہندوستانی لڑکیوں کی تعلیم وتربیت کی تفصیلات بیان کی ہیں۔ اس نظم میں انہوں نے عورتوں کو امور خانہ داری سیکھنے' سینا پرونا سیکھنے ضروری حساب کتاب سیکھنے مذہب کے اصولوں سے واقفیت حاصل کرنے اور زندگی کے دوسرے کام سیکھنے کی تلقین کی۔ نظم کا آغاز انہوں نے اس طرح کیا۔

؎ تعلیم عورتوں کو بھی دینی ضرور ہے
لڑکی جو بے پڑھی ہو تو وہ بے شعور ہے

اکبر کے کلام میں متفرق اشعار کی کثرت ہے۔ وہ اچھے خیال کو دو چار شعر میں پیش کر دیتے ہیں اور پھر اظہار کا پیمانہ بدل دیتے ہیں۔ اکبر نے نظموں اور غزلوں کے علاوہ رباعیات بھی کہی ہیں۔ ان کی رباعیاں اخلاقی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ پند ونصیحت اور رباعی کے دیگر موضوعات ان کے ہاں پائے جاتے ہیں۔ اکبر کی دو رباعیاں اس طرح ہیں۔

اونچا نیت کا اپنی زینا رکھنا
احباب سے صاف اپنا سینا رکھنا
غصہ آنا تو نیچرل ہے اکبؔر
لیکن ہے شدید عیب کینا رکھنا

اس طرح اکبؔر کی شاعری سے مثالیں پیش کرتے ہوئے سرور نے ان کی شاعری کے طنزیہ اور مزاحیہ پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔

مختصر سوال جواب:

سوال: قطعہ کسے کہتے ہیں۔

جواب: قطع کے لغوی معنی ٹکڑے یا کاٹے ہوئے حصہ کے ہیں۔شاعری کی اصطلاح میں قطع دو یا دو سے زائد ایسے اشعار کو کہتے ہیں جس میں بات بیان کی جاتی ہے۔غزل یا قصیدہ میں جب ایک شعر میں بات مکمل نہیں ہوتی ہے تو شاعر ایک سے زائد اشعار میں بات مکمل کرتا تھا۔ بعد میں صنف کے طور پر بھی قطعات لکھے جانے لگے۔اس میں قافیہ ردیف کی پابندی ہوتی ہے۔

سوال: اکبؔر الہ آبادی کا مختصر تعارف بیان کیجئے۔

جواب: اکبر حسین اکبؔر الہ آبادی (1846-1921) طنز و مزاح کے بڑے شاعر گزرے ہیں۔اُنھوں نے اسلامی تہذیب کی حفاظت پر زور دیا اور انگریزی تہذیب اختیار کرنے والے مسلمانوں کو طنز کا نشانہ بنایا۔غربت میں ترقی کرتے ہوئے انہوں نے عدالت کے جج کے عہدے تک ترقی کی۔ انگریزی تہذیب کو قریب سے دیکھا۔ مزاحیہ شاعری کو اپنایا۔آتشؔ کے شاگرد تھے۔اکبؔر ایک فطری شاعر تھے۔بچپن سے شعر کہنے لگے تھے۔اس زمانے کے مشہور شاعر غلام وحید سے اصلاح لیتے تھے۔اکبؔر نے اپنی شاعری کی ابتداء روایتی طرز کی غزل گوئی سے کی۔ان کے ابتدائی کلام میں رنگینیٔ شوخی اور روایتی لب ولہجہ میں ہجر و وصال کا بیان ہے۔زبان کا چٹخارہ، روایت لفظی کا اہتمام اور دور از کار تشبیہات کا استعمال ان کے کلام میں دکھائی دیتا ہے۔اودھ پنچ کی طنز و مزاح کی تحریک کے آغاز کے ساتھ اکبؔر مزاحیہ شاعری کرنے لگے کلیات اکبؔر پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے غزل، نظم، رباعی، قطعات اور کئی متفرق اشعار پر مبنی اپنی طنز و مزاح اور سنجیدہ شاعری کو پیش کیا ہے۔

قطعہ اقبؔال

انداز بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں
شائد کہ اُتر جائے ترے دل میں مری بات
یا وسعت افلاک میں تکبیر مسلسل
یا خاک کی آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مذہب مردانِ خود آگاہ و خدا مست
یہ مذہب مُلّا و جمادات و نباتات

سوال: اقبالؔ کے قطعہ کا خلاصہ لکھئے۔

جواب: **اقبالؔ کا تعارف:-** ڈاکٹر محمد اقبال (1877-1938) اُردو کے مشہور مفکر و فلسفی شاعر گزرے ہیں۔ اُنھوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ حرکت و عمل کے پیغام کو عام کیا اور لوگوں میں اسلامی فکر زندہ کرنے کی کوشش کی۔ تصور عشق، تصور خودی، مرد مومن، انسان کامل، عورت کا مقام اور تعلیم کی روح کے نظریہ پیش کرتے ہوئے وہ اُردو کے عظیم مفکر شاعر قرار پائے۔ اُنھوں نے اپنے قطعات میں مسلمانوں کی مذہب بیزاری پر افسوس کیا اور اُن کی اصلاح کی کوشش کی۔ ان کے مندرجہ بالا قطعہ کا خلاصہ پیش ہے۔

خلاصہ قطعہ:- اقبالؔ اس قطعہ میں کہتے ہیں کہ میرا انداز بیان نہ جوشیلا ہے نہ شوخ ہے۔ میں سیدھے انداز میں بات کہہ رہا ہوں۔ بعض لوگ اپنے مخصوص طرز بیان سے اس طرح بات پیش کرتے ہیں کہ سننے والوں کو بات اچھی لگتی ہے لیکن اس کا اثر دل پر نہیں ہوتا۔ اور نہ بات اسے تبدیل ہونے پر مجبور کرتی ہے۔ اس لئے اقبال پہلے ہی کہہ رہے ہیں کہ میں اپنی بات کو اثر دار بنانے کیلئے اُس میں شوخی کا عنصر شامل نہیں کر رہا ہوں۔ لیکن چونکہ اصلاحی جذبے کے تحت وہ بات پیش کر رہے ہیں اس لئے وہ کہتے ہیں کہ مجھے اُمید ہیکہ پڑھنے والوں اور سننے والوں کے دل میں میری بات اُتر جائے۔ اس طرح اقبال تمام مصلحین قوم، واعظین اور علمائے کرام و مقررین کو بنیادی اُصول بیان کر رہے ہیں کہ اصلاح کی بات سیدھے سادھے واضح انداز میں کہنی چاہئے اور اُس میں نمک مرچ لگا کر شوخی کے ساتھ اُسے پیش نہ کرنا چاہئے کیونکہ اس سے بات کانوں کو تو بھلی معلوم ہوتی ہے لیکن اس کا اثر دل پر نہیں ہوتا اور اصلاح کا مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ اس لئے اقبال کہہ رہے ہیں کہ وہ جو بات کہنے جا رہے ہیں سادھے انداز میں دوٹوک طریقے سے کہہ رہے ہیں۔ یہ بات بیان کرنے کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح ہے۔ اس لئے وہ اُمید کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے دلوں میں ان کی بات اُتر جائے اور وہ اپنے رویہ میں تبدیلی لاتے ہوئے سدھر جائیں چنانچہ وہ اپنی اصل بات بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مسلمان مذہب کے معاملے میں افراط و تفریط (بہت زیادہ اچھا یا بہت زیادہ بُرا) کا شکار ہیں۔ اسلام میں حق کیلئے جہاد کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ چنانچہ جو لوگ جہاد کے جذبے سے سرشار ہیں وہ اللہ اکبر کے نعروں کی گونج کے ساتھ تلوار نکالے جان دینے کیلئے نکل پڑتے ہیں۔ یہ لوگ ایمان کی حرارت کے ساتھ اسلام کی بقاء کیلئے لڑتے ہیں۔ اقبالؔ کا اشارہ اُن صحابہ کرامؓ کی طرف ہے جن کے پاس ایمان کی دولت بہت تھی لیکن دنیا کی مال و دولت، ہتھیار و گولہ بارود نہیں کے برابر تھا۔ اس کے باوجود اللہ کی مدد اور نصرت کے ساتھ حق کیلئے جدوجہد کرتے ہوئے مسلمان بہت کم وقت میں آدھی دنیا پر قابض ہوگئے تھے۔ لیکن زمانہ گزرنے کے بعد مسلمانوں کی ایمانی حرارت میں کمی آگئی۔ اسلامی تعلیمات کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے میں کوتاہی ہونے لگی۔ مذہبی تعلیمات کو رسم و رواج کے طور پر استعمال کیا جانے لگا۔ خدا اور اُس کے رسول کی محبت صرف زبان پر رہ گئی اور عمل میں لوگ پیچھے رہنے لگے۔ خانقاہی نظام وجود میں آیا۔ اب لوگ مسجدوں اور خانقاہوں میں بیٹھ کر تسبیح پڑھنے لگے۔ خدا اور اُس کے رسول کی تعریف کے گیت گانے میں لگ گئے۔ جبکہ ضرورت اس بات کی تھی کہ صحابہؓ کی طرح عبادات اور زندگی کے ہر کام میں دین کو سامنے رکھتے اور اُس پر عمل کرتے۔ آج دنیا سے بے دینی دور کرنے کیلئے لوگوں کو دین کی دعوت پیش کرنے کی ضرورت ہے۔ لوگ خود دین پر چلیں گے اور دوسروں کو بُرائی سے روکتے ہوئے اچھے کاموں کی تلقین کریں گے تب ہی ایمان کے تقاضے مکمل ہو سکتے ہیں۔ باہر بے دینی کی آگ لگی ہے اور ہم مسجد میں یا خانقاہ میں بیٹھے ذکر میں مشغول ہوں تو یہ بے دینی کی آگ ہمارے گھروں تک آکر ہمیں اور ہماری نسلوں کو جلا کر خاک کر دے گی۔ اس لئے اقبال نے اپنے خول میں بند جمادات و نباتات کی طرح

ظاہری حالات پر نظر رکھنے والے، مُلّا قسم کے مسلمانوں کو خبردار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ آج کا دور صد فیصد مسلمان ہونے کا ہے۔ ہم صرف اپنے روزے، نماز، زکوٰۃ اور حج جیسی ظاہری عبادتوں سے صد فیصد مسلمان ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔ ہمارے ذکر واذکار ہمیں اس وقت تک کامیابی نہیں دلا سکتے جب ہم گھر اور باہر کی زندگی کے ہر کام میں اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا نہ ہوں۔ اور صحابہؓ جیسی کامل انسانوں والی زندگی اختیار نہ کرلیں۔ یہ وہ صحابہؓ تھے جن کی تکبیر اور دعاؤں سے آسمان دہل جاتے تھے، خدائی فیصلے ہوتے تھے، سخت گرما میں دعا سے بارش ہوتی تھی۔ غیب سے غذا کا انتظام ہوتا تھا۔ سوکھے کنویں سے پانی ملتا تھا، غذا میں برکت ہوتی تھی اور زندگی میں خوشحالی آتی تھی۔ آج مسلمان حج کر رہا ہے، کعبہ کی دیوار کو پکڑ کر دعا کر رہا ہے لیکن چونکہ وہ صد فیصد مسلمان نہیں ایمان کی حرارت والا نہیں اس لئے اس کی دعائیں بے اثر ہیں۔ اس لئے اقبالؔ لوگوں کو صد فیصد دین پر عمل کرتے ہوئے کامل مسلمان اور کامل انسان بننے کی تلقین کرتے ہیں۔

مرکزی خیال:- اقبالؔ اس قطعہ میں زمانہ قدیم اور موجودہ دور کے مسلمانوں کا تقابل کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ پہلے زمانے کے مسلمان ایمان کی طاقت سے سرشار کامل مسلمان تھے اس لئے ان کی تکبیروں اور آوازوں سے آسمان دہل جاتا تھا۔ جبکہ آج کے دور کے مسلمان ظاہری ہیں۔ صرف تسبیح پڑھنے اور اسباب سے ہونے کا یقین رکھتے ہیں۔ اس لئے ان کے عمل سے تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ اس لئے اقبالؔ مسلمانوں کو کامل دین پر چلنے کی دعوت دیتے ہیں۔

سوال: اقبالؔ کی شاعری پر نوٹ لکھو؟

جواب: ڈاکٹر سر محمد اقبالؔ اردو اور فارسی کے مشہور مفکر اور فلسفی شاعر گذرے ہیں۔ وہ 9 نومبر 1877ء کو موجودہ پاکستان کے صوبہ پنجاب کے مشہور شہر سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ ان کے آباء واجداد کشمیری تھے۔ اقبالؔ کی ابتدائی تعلیم سیالکوٹ میں ہوئی۔ ان کے والد شیخ نور محمد نے ان کی تعلیم وتربیت کے لئے انہیں مشہور شخصیت سید میر حسن کے حوالے کیا۔ اقبالؔ کے زندگی پر اپنے اس استاد کا بہت اثر رہا۔ اقبالؔ کی اعلیٰ تعلیم لاہور میں ہوئی۔ جہاں سے انہوں نے 1897ء میں بی اے اور 1899ء میں فلسفہ سے ایم اے کیا۔ اورنیشنل کالج لاہور میں عربی کے استاد مقرر ہوئے۔ 1903ء میں گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوئے۔ 1905ء میں اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان گئے۔ اور تین سال کے لئے یوروپ میں قیام کیا۔ لندن میں بیرسٹر لاء اور جرمنی کی میونک یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ان کے ڈاکٹریٹ کے مقالہ کا عنوان Development of Meta Physics in Persia (ایران میں مابعد طبعیات کا ارتقاء) تھا۔ یہ مقالہ بعد میں لندن سے شائع ہوا۔ جرمن اور اردو میں بھی شائع ہوا۔ اقبالؔ 27 جولائی 1908ء کو لاہور واپس ہوئے۔ اور وکالت شروع کی۔ اس کے ساتھ لاہور میں فلسفہ کی تعلیم بھی دیتے رہے۔ بعد میں پروفیسری سے استعفیٰ دے دیا اور وکالت کو جاری رکھا۔

اقبالؔ کو بچپن سے شعر گوئی سے دلچسپی تھی۔ اس زمانے میں آزادی ہند کی تحریک اپنی طفولیت کی منزل میں تھی۔ اقبالؔ نے پر جوش قومی اور وطنی نظموں کے ذریعے اس زمانے میں ہندوستانیوں کو انگریزوں کے خلاف جدوجہد آزدای میں حصہ لینے اور انہیں انگریزوں کے خلاف متحد کرنا شروع کیا۔ ان کی نظمیں ''ترانہ ہندی' نیا شوالہ' پرندے کی فریاد' ہندوستانی بچوں کا قومی گیت' ہندوستان کی قومی شاعری کی بہترین مثال ہے۔ ان اثر انگیز نظموں کے ذریعے اقبالؔ نے قومی یکجہتی کا تصور پیش کیا۔ یورپ سے واپسی کے بعد اقبالؔ کے افکار اور خیالات میں بڑی تبدیلی آئی۔ اب ساری دنیا کے انسان ان کی شاعری کے مخاطب بن گئے۔ انہوں نے تمام انسانوں کو قوم نسل ملک اور

زبان کے امتیازات سے بلند ہوکر بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود کو اپنا نصب العین بنایا۔ اس طرح انہوں نے اپنی شاعری کو اپنے خاص پیام اور تعلیمات کا ذریعہ بنایا۔ اقبالؔ نے لوگوں کو حرکت اور عمل کی تلقین کی۔ خودی، عشق، اور مردمومن کا تصور پیش کیا۔ شاہین پرندے کو بہ طور علامت کے استعمال کیا۔ 1923ء میں حکومت کی جانب سے ڈاکٹر محمد اقبالؔ کو سر کا خطاب دیا گیا۔ اور اقبالؔ ہی کی فرمائیش پر ان کے استاد سید میر حسن کو شمس العلماء کا خطاب دیا گیا۔ 21 اپریل 1938ء کو اقبالؔ کا لاہور میں انتقال ہوا۔ اقبالؔ کی شاعری کے چار مجموعے بانگ درا، بال جبریل، ضرب کلیم اور ارمغان حجاز مشہور ہیں۔ اقبالؔ کے کلام کے دنیا بھر کی بیشتر زبانوں میں تراجم شائع ہو چکے ہیں۔ اقبالؔ کا کلام فلسفیانہ بصیرت، شاعرانہ حسن اور اثر انگیزی کا ایک حسین امتزاج ہے۔

اقبالؔ کو ہم سے جدا ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گذرا ان کی وفات کے بعد ان کی حیات اور ان کے کارناموں پر کئی جلسے ہوئے تقریریں کی گئیں، اخباروں میں مضامین لکھے گئے خاص نمبر شائع کئے گئے اور ان کے پیغام کو عام کیا گیا۔ اقبالؔ ہم سے جدا ہوئے لیکن اپنی فکر و فلسفہ کے ساتھ ہمیشہ کیلئے ہمارے ساتھ زندہ جاوید ہو گئے اسی میں اقبالؔ کی مقبولیت کا راز چھپا ہوا ہے۔ عام آدمی سے اقبالؔ کے بارے میں پوچھا جائے تو کہے گا کہ اقبالؔ نے ہمیں ''قومی ترانہ'' جیسی نظم دی ہے جس سے وطن کی محبت اور جوش ولولہ پیدا ہوتا ہے ایک نقاد سے پوچھا جائے تو کہے گا کہ اقبالؔ نے اُردو شاعری کو فکر و فلسفہ دیا اور نوجوانوں کیلئے عمل کا پیغام دیا اور ان کا کلام ماضی کی یاد ہے اور مستقبل کا تصور ہے۔ ان کا کلام زندگی کا احساس دلاتا ہے عمل کیلئے راغب کرتا ہے اقبالؔ نے اپنی شاعری سے پیغمبری کی۔

اقبالؔ کو فلسفی کہنا ان کی بڑی توہین ہے کیونکہ فلسفی حقیقت کی خشک اور بے جان تفسیر کرتا ہے وہ کائنات کو اپنے ذہن سے سمجھتا ہے وہ مادّہ اور روح کی بحث میں الجھا رہتا ہے اور ہر جگہ عقل کو سامنے رکھتا ہے۔ اقبالؔ فلسفی اس لئے نہیں کہ انہوں نے عشق کو عقل پر فوقیت دی ان کا اپنا فلسفہ حیات ہے یہ فلسفہ حیات نہ تو فقیر کی جھولی کی طرح ہے جس میں ادھر اُدھر سے مانگ کر بھیک کے ٹکڑے جمع کئے جاتے ہیں نہ یہ خودرو ہے بلکہ اس میں ہمارے تمام سرمایہ ذہنی کی ترقی یافتہ شکل ملتی ہے۔ اقبالؔ نے مشرق اور مغرب کے حکماء اور مفکروں کے خیالات سے استفادہ کیا ہے ان کا مطالعہ وسیع ہے اور نظر گہری ہے مغربی مفکروں میں اقبالؔ نیٹشے اور برگسان سے متاثر ہیں اور مشرقی مفکروں میں جمال الدین افغانی، مجدد الف ثانی، اور بیدلؔ، و غالبؔ کا بھرا اثر قبول کیا اقبالؔ نے جس دور میں آنکھ کھولی وہ غلامی اور مایوسی کا دور تھا۔ لوگ خواب غفلت میں ڈوبے ہوئے تھے اور حرکت و عمل سے دور تھے۔ اس سے زندگی کی رفتار کم تھی صوفیوں کی تعلیمات لوگوں کو دنیا سے دور کر رہی تھی۔ اقبالؔ نے محسوس کیا کہ تعلیم کو عام کرتے ہوئے اور لوگوں میں حرکت و عمل کا جذبہ پیدا کرتے ہوئے انہیں خوابِ غفلت سے جگایا جا سکتا ہے انہوں نے محسوس کیا کہ عشق کی چنگاری جلا کر لوگوں کو کچھ کرنے کیلئے راغب کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اقبالؔ نے خودی کا نظریہ پیش کیا جس میں فرد کی تعمیر و اصلاح ہوتی ہے اسی لئے خودی کے بارے میں اقبالؔ کہتے ہیں کہ ؎

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے　　خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

اقبالؔ کہتے ہیں کہ خودی کی تعمیر و اطاعت، ضبط نفس اور نیابت الٰہی سے ہوتی ہے۔ اقبالؔ کے فلسفہ میں حرکت و عمل کا پیغام اہم ہے خاموشی اور جمود سے نفرت کرتے ہیں اقبالؔ کے نزدیک شباب آرام کیلئے نہیں بلکہ کچھ کرنے کیلئے ہے اقبالؔ نے جہاں کہیں شاہین کا استعارہ استعمال کیا ہے وہاں انہوں نے لوگوں کو عمل کا پیام دیا ہے اقبالؔ کے مردمومن کی یہ پہچان ہیکہ وہ جنگ میں آگے بڑھ کر لڑتا

ہے اور امن کی حالت میں سادگی کی زندگی گذارتا ہے اقبالؔ نے جہاں کہیں فرد کی اصلاح کی بات کہی ہے ان کا مقصد فرد کے ذریعہ سماج کی اصلاح ہے یعنی اقبالؔ کسی ایک فرقہ یا مسلک کے شاعر نہیں ہے بلکہ وہ تمام انسانوں سے خطاب کرتے ہیں۔ اور ان کا پیام ساری انسانیت کیلئے ہے۔

مغرب نے خودی کے فلسفہ پر عمل کرتے ہوئے ترقی کی لیکن اطاعت الٰہی ضبط نفس اور نیابت الٰہی کا منصب چھوڑ دینے سے مسلمان روحانی طور پر پیچھے رہنے لگا۔ اقبالؔ روحانی ترقی پر بھی زور دیتے ہیں کیونکہ روحانی نظام کی بنیاد توحید پر قائم ہے اور توحید کا فلسفہ دنیا میں رہنے والے تمام انسانوں کو رنگ و نسل و ذات پات ادنیٰ و اعلیٰ کی قید سے آزاد کرتے ہوئے ایک رشتہ میں پروتا ہے۔ اقبالؔ نے اپنی شاعری کے ذریعہ وطن کی آزادی پر زور دیا ہے کیونکہ غلامی انسان کی تمام خوبیوں کو مٹا دیتی ہے اور آزادی سے ترقی میں مدد ملتی ہے اقبالؔ آزادی کے ساتھ مساوات پر بھی زور دیتے ہیں وہ انسانوں کو مختلف طبقوں میں بانٹنے کے مخالف ہیں وہ انسانوں کے حقوق کی علم برداری کرتے ہیں وہ مزدور کا حق دلانا چاہتے ہیں اور انسانوں کے بنائے ہوئے مختلف ازم (Isms) کو ناپسند کرتے ہیں۔

اقبالؔ نے اپنی نظموں میں ابلیس کی تعریف کی ہے کیونکہ اقبالؔ محسوس کرتے ہیں کہ ابلیس ہمیشہ انسانوں کے پیچھے پڑا رہتا ہے اور انہیں خدا کی نافرمانی پر اکساتا رہتا ہے ابلیس کے بہکاوے میں نہ آتے ہوئے لوگ نیکی کی طرف راغب ہوتے ہیں اس طرح اگر ابلیس نہ ہوتا تو لوگ کچھ نہیں کرتے مجموعی طور پر اقبالؔ انسان کو حرکت و عمل کا پیام دیتے ہوئے اسے بلند مقام حاصل کرنے کی نصیحت کرتے ہیں۔ یہی ان کے فلسفہ خودی کی روح ہے وہ مسلسل پرواز تلاش پیہم اور آگے بڑھنے کی بے پناہ آرزو کے قائل ہیں۔ اقبالؔ نے اپنی شاعری کو اپنے فلسفہ اور خاص پیام تعلیمات کا ذریعہ بنایا وہ بلاشبہ شاعر مشرق کے خطاب کے مستحق ہیں ان کی شاعری کا اثر بعد کے اُردو اور فارسی شاعروں پر پڑا۔

مختصر سوال جواب

سوال: اقبالؔ کا مختصر تعارف بیان کرو۔

جواب: ڈاکٹر محمد اقبال (1877-1938) اُردو کے مشہور مفکر و فلسفی شاعر گزرے ہیں۔ اُنھوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ حرکت و عمل کے پیغام کو عام کیا اور لوگوں میں اسلامی فکر زندہ کرنے کی کوشش کی۔ تصور عشق، تصور خودی، مرد مومن، انسان کامل، عورت کا مقام اور تعلیم کی روح کے نظریہ پیش کرتے ہوئے وہ اُردو کے عظیم مفکر شاعر قرار پائے۔

سوال: اقبالؔ کے شعری مجموعوں کے نام لکھو۔

جواب: اقبال کے شعری مجموعے بانگ درا۔ بال جبریل۔ ضرب کلیم۔ ارمغان حجاز ہیں۔

حصہ نثر انتخاب سب رس از: ملا وجہی

سوال: داستان کسے کہتے ہیں۔اردو میں داستان نگاری کا ارتقاء بیان کیجئے؟

جواب: داستان اردو نثر کی ایک صنف ہے۔لفظ داستان پہلوی زبان سے فارسی اور پھر اردو میں منتقل ہوا۔جس کے معنی قصہ یا کہانی کے ہیں۔ اردو کی اصطلاح میں داستان ایسی طویل کہانی کو کہتے ہیں جس میں قصہ در قصہ کی تکنیک استعمال کرتے ہوئے کہانی بیان کی جاتی ہے۔اور ضمنی کہانیوں کا اصل کہانی سے ربط بھی ہوتا ہے۔داستان کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ یہ طویل ہوتی ہے اور اس میں مافوق الفطرت عناصر شامل ہوتے ہیں۔داستان میں خیالی دنیا بسائی جاتی ہے۔بے شمار کردار ہوتے ہیں اور ان کے ذریعے حیرت انگیز کارنامے بیان کئے جاتے ہیں۔ داستان میں کہانی کے اجزا پلاٹ۔کردار۔مکالمہ۔منظر۔منظر۔وحدت تاثر۔زماں و مکاں۔آغاز و انجام ہوتا ہے۔انجام کے اعتبار سے داستانیں المیہ اور طربیہ ہوتی ہیں۔داستانوں کا پلاٹ غیر مربوط اور قصہ در قصہ کی تکنیک پر مشتمل ہوتا ہے۔ایک قصہ کے بعد دوسرا قصہ شروع ہوجاتا ہے جو اصل قصے سے مربوط رہتا ہے۔داستانوں میں شاہی گھرانوں کے کردار ہوتے ہیں۔جن کے سامنے کوئی مسئلہ پیش آتا ہے۔ جس کے حل کے لئے وہ جن دیو بھوت پریت۔جادو کی چھڑی تعویز وغیرہ کا استعمال کرتے ہیں۔شر پر خیر کی فتح ہوتی ہے اور انجام خوشی پر ہوتا ہے۔داستانوں میں طویل اور غیر فطری مناظر پیش کئے گئے۔مقامات اور کرداروں کے نام بھی فرضی ہوتے ہیں جن کا حقیقیت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔داستانیں ایک ایسے دور میں کہی اور لکھی گئیں جب انسان کے پاس فرصت کے اوقات تھے اور اس کی دل بہلائی کا کوئی دوسرا ذریعے نہیں تھا۔ایک میدان میں رات کے وقت بادشاہ اور عوام داستان گو کے ساتھ بیٹھ جاتے تھے۔داستان گو قصہ سناتا جاتا اور اسے ایسے موڑ پر لاکر روکتا کہ اگلے دن لوگ تجسس میں کہ اب کیا ہوگا پھر سے داستان سننے کے لئے جمع ہوجاتے تھے۔اردو میں جو داستانیں لکھی گئیں وہ بھی زوال پذیر شاہی دور کی عکاسی کرتی ہیں جب کہ بادشاہ اور عوام کے پاس فرصت کے اوقات تھے اور جو کام انسان عام زندگی میں نہیں کر پایا اسے داستانوں میں ہوتا دکھایا گیا۔داستانوں میں خیالی جنت کی تصویریں پیش کی گئیں۔داستانوں کی اہمیت یوں بھی ہے کہ ان میں جن خیالی باتوں کو پیش کیا گیا بعد میں انہیں حقیقیت کا روپ دینے کی کوشش کی گئی جیسے ٹیلی ویژن۔ہوائی جہاز وغیرہ۔

اردو میں داستانوں کا ارتقاء: اردو میں ابتداء میں منظوم داستانیں پیش کی گئیں۔جو مثنویوں میں موجود ہیں۔اردو کی پہلی نثری داستان ''سب رس'' ہے۔جسے قطب شاہی عہد کے شاعر ملا وجہی نے 1635ء م 1045 ہجری میں گولکنڈہ میں لکھی۔اس داستان میں قصہ حسن و دل کو پیش کیا گیا۔سب رس میں مقفیٰ و مسجع اسلوب کو اختیار کیا گیا۔شمالی ہند کی ایک داستان ''قصہ مہر افروز و دلبر'' ہے۔جسے عبوی خان نے لکھا۔عطا محمد حسین عطا خان تحسین نے ''نوطرز مرصع'' کے نام سے ایک داستان لکھی۔جسے بنیاد بنا کر میر امن نے ''داستان باغ و بہار'' لکھی۔جو اردو کی ایک مشہور داستان ہے۔اس میں قصہ چہار درویش کو پیش کیا گیا۔اردو میں داستان نگاری کے فروغ میں کلکتہ میں 1800ء میں قائم کردہ فورٹ ولیم کالج نے بھی اہم رول ادا کیا۔جب کہ کالج کے پرنسپل جان گلکر یسٹ نے ہندوستان میں کام کر رہے انگریزوں کو اردو اور ہندوستانی تہذیب سکھانے کے لئے یہ کالج قائم کیا۔اور اہم مصنفین کو بلا کر اردو کی اہم داستانوں کا آسان زبان میں ترجمہ کروایا۔اس کالج کے تحت جو داستانیں لکھی گئیں ان میں باغ و بہار (میر امن)' آرائش محفل۔طوطا کہانی (حیدر بخش حیدری) داستان امیر حمزہ (خلیل خاں

اشک) بیتال پچیسی (ظفر علی خاں ولا) شکنتلا (للولال کوی) ۔فورٹ ولیم کالج کے باہر کی مشہور داستان ۔داستان امیر حمزہ ہے۔ مدراس میں بھی ایک کالج فورٹ سینٹ کالج قائم کیا گیا۔ جہاں اردو کی داستانوں کے تراجم ہوئے۔لکھنو کی مشہور داستان رجب علی بیگ سرور کی فسانہ عجائب ہے۔ جو 1824ء میں لکھی گئی۔صنعتی انقلاب۔ 1857ء کے انقلاب کے بعد حقیقت پسندی کو فروغ ملا۔جس سے داستانوں کو زوال آ گیا۔اوراس کی جگہ ناول کی صنف نے ترقی کی۔

سوال: داستان ''سب رس'' میں بیان کیے گئے اخلاقی پہلوؤں کو اپنے الفاظ میں لکھئے۔

جواب:- داستان کی تعریف :- قدیم قصوں اور کہانی کو داستان کہتے ہیں۔داستانیں طویل ہوتی ہیں۔ان میں کئی کہانیوں کو جوڑا جاتا ہے۔خواب وخیال کی باتیں،سحر جادو،جن دیو، بھوت پریت کے ذریعہ غیر معمولی باتوں کو داستان میں پیش کیا جاتا ہے۔شر پر خیر کی فتح دکھائی جاتی ہے۔ مافوق الفطرت عناصر اور خیالی کہانیاں داستان کی اہم خوبیاں ہیں۔ داستان امیر حمزہ، الف لیلیٰ، سب رس، بیتال پچیسی، قصہ حاتم طائی، داستاں امیر حمزہ وغیرہ مشہور داستانیں ہیں۔

مُلّا وجہی کا تعارف :- مُلّا وجہی قطب شاہی دور کے مشہور شاعر اور داستان نگار تھے۔اُنہوں نے 1045ھ 1635ء میں اُردو کی پہلی نثری داستان ''سب رس'' لکھی۔اس داستان میں تمثیل نگاری سے کام لیا گیا۔اور عشق، عقل، حسن اور دل، حُسن، نیکی، بدی وغیرہ کیفیات کو متحرک کرداروں کی شکل میں پیش کیا گیا۔ داستان ''سب رس'' میں قصہ حسن و دل پیش کیا گیا۔ درمیان میں وجہی فلسفیانہ باتیں اور زندگی سے متعلق فکر انگیز باتیں بیان کرتے ہیں۔ داستان کا اسلوب مقفیٰ و مسجع ہے۔ داستان کے ایک حصہ میں وجہی نے اخلاقی اور اصلاحی باتیں بیان کی ہیں جن کا خلاصہ اس طرح ہے۔

ا۔ جھوٹ مت بولو:- انتخاب سب رس کے اس اقتباس میں مُلّا وجہی کہتے ہیں کہ دنیا میں مصلحت اختیار کرتے ہوئے کام انجام پاتے ہیں۔ اکثر کام سچائی کے ساتھ ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ جھوٹ کا سہارا لے کر کام نکالتے ہیں۔لوگوں کی فطرت ہوگئی ہے کہ جھوٹے کی بات کو سچ سمجھا جاتا ہے اور اگر کوئی حق پر رہ کر سچ کہتا ہے تو اسے اہمیت نہیں دی جاتی۔ جھوٹے لوگوں کو پسند کیا جاتا ہے۔جھوٹے لوگ ایسی باتیں کہتے ہیں جو حقیقت میں نہ ہوئی ہوں۔ جھوٹے لوگ دشمنی پھیلاتے ہیں، جھوٹے کا اس دنیا میں ایک نہ ایک دن منہ کالا ہوجاتا ہے اور وہ بدنام ہوجاتا ہے۔جھوٹے لوگ فتنہ پھیلاتے ہیں، جھوٹے لوگ شیطان صفت ہوتے ہیں۔اُن سے خدا ہی ہماری حفاظت کرے۔

(۲) ہر حال میں خوش رہو:- ''سب رس'' سے لئے گئے دوسرے اقتباس میں ملا وجہی کہتے ہیں کہ جس کو غم نہیں وہ نایاب ہے یعنی کوئی آدمی ایسا نہیں جسے کوئی بھی غم نہ ہو۔خوشی یا غم فرد کے اوپر منحصر ہے۔ چاہے وہ اپنی زندگی کو خوشگوار بنالے یا غموں سے دوچار کرلے۔ جو آدمی آگے بڑھنا چاہتا ہے، اس کے راستے میں دشواریاں آتی ہیں۔لوہار کو کام کے دوران آگ سے جلنا پڑتا ہے۔ پانی میں تیرنے والا غوطہ مارنے کے دوران کبھی ڈوبتا بھی ہے۔حکومت چلانے والے بادشاہ بھی کبھی خوش رہتے ہیں تو کبھی غمگین۔ جو آدمی دُکھوں کو برداشت کرتا ہے اور غم کے وقت خوش رہتا ہے وہی مرد ہے۔گنگا ندی گرمیوں میں سُکڑ جاتی ہے۔اور بارش میں پھیل جاتی ہے۔جنگل کے درختوں پر کبھی ہرے بھرے پتے لگے ہوئے ہوتے ہیں تو کبھی ان درختوں پر خزاں چھا جاتی ہے۔اگر ہمیشہ زندگی ایک ڈھنگ پر چلتی رہے تو زندگی اور موت کا کوئی

مطلب ہی نہیں۔صرف خدا کی ذات ہمیشہ باقی رہنے والی ہے۔اُس میں کبھی تبدیلی نہیں۔

(۳) طمع سے پرہیز کرو:- ''سب رس'' داستان سے ماخوذ تیسرے اقتباس میں مُلّا وجہی نصیحت کرتے ہوئے لوگوں سے کہتے ہیں کہ لالچ کے نقصانات زیادہ ہیں۔لالچ سے عزت کو نقصان پہونچتا ہے۔لوگوں کے نزدیک ہماری حیثیت اور وقار گھٹ جاتا ہے۔لالچ سے آدمی کا دین اور ایمان جاتا رہتا ہے۔لالچ اور حرص کی وجہ سے آدم علیہ السلام جنت سے نکالے گئے تھے اور انھیں دنیا کے قید خانے اور یہاں کے جھمیلوں میں ڈال دیا گیا تھا جن لوگوں کے بزرگ لالچ اور طمع سے بدنام ہوگئے تھے اُن کی اولاد سے لالچ سے بچے رہنے کی کیسے اُمید کی جاسکتی ہے۔لالچی انسان اپنا سر کبھی اونچا نہیں کرسکتا۔جہاں جاتا وہاں بے عزت ہوتا ہے کیونکہ اس کے سر پر لالچ کا بوجھ رہتا ہے اور اُسی بوجھ کی وجہ سے اُس کا سر ہمیشہ جھکا رہتا ہے۔

(۴) دنیا پرستی سے بچو:- داستان ''سب رس'' سے ماخوذ اس چوتھے اقتباس میں مُلّا وجہی لوگوں کو دنیا پرستی سے بچنے کی تلقین کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ دنیا بہت بُری جگہ ہے کیونکہ اس دنیا کے مال و دولت کی خاطر لوگ اپنے ماں باپ کی جان بھی لے لیتے ہیں اور سگے بھائیوں کے درمیان اس دنیا کیلئے دشمنی پیدا ہوجاتی ہے۔لوگ دنیا ہی کو باپ ماں اور بھائی سمجھتے ہیں۔حالانکہ یہ دنیا کسی کی بھی نہیں ہوسکتی۔ دولت کے نشہ میں لوگ ماں باپ خدا اور رسول کو بھلا بیٹھے ہیں۔دنیا دغاباز ہے۔یہاں کے مکروفریب،تماشے بہت ہیں۔عقلمند وہی ہے جو یہاں ہوشیار رہے اور اپنے گھر والوں اور دوستوں سے بھی محتاط رہے۔تب ہی وہ دنیا پرستی سے بچ سکتا ہے۔

(۵) نیکی کرو:- داستان ''سب رس'' سے ماخوذ پانچویں اقتباس میں مُلّا وجہی لوگوں کو نیکی کی تلقین کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ دنیا میں مال و دولت کو عزت سمجھا جاتا ہے اور آخرت کی عزت نیک اعمال ہے۔مال خرچ کرکے آخرت کیلئے اعمال تیار کرنا چاہئے۔غریبی و مفلسی کسی کو اچھی نہیں لگتی،نہ دنیا میں کام آتی ہے اور نہ آخرت میں۔دوست وہی ہے جو ہمدردی کرے،ڈھارس بندھائے،خدا دشمن کو بھی مفلسی نصیب نہ کرے۔دنیا کی زندگی کی طرح مرنے کے بعد بھی زندگی ہے جس کیلئے یہاں نیک اعمال کرنا ہے۔آخرت میں ماں باپ بھی کسی کے کام نہ آئیں گے۔صرف آدمی کی نیکیاں ہی وہاں کام آئیں گی۔اس لئے آدمی کو اپنی آخرت سنوارنے کیلئے نیکیاں کرتے رہنا چاہئے۔

(۶) ماں باپ کی عزت کرو:- داستان ''سب رس'' سے ماخوذ چھٹے اقتباس میں وجہی ماں باپ کی عظمت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ والدین کا مرتبہ بہت بلند ہے۔اولاد کو چاہئے کہ والدین کا حکم مانے۔کیونکہ وہ اولاد کی پرورش کرتے ہیں پال پوس کر بڑا کرتے ہیں۔ جوان اولاد ماں باپ کی بے ادبی نہ کرے۔ماں باپ کی خوشی میں ہی خدا اور رسول کی رضامندی ہے اور آدمی کیلئے دونوں جہاں میں کامیابی ہے۔اس لئے آدمی کو چاہئے کہ والدین کو راضی رکھے۔اُن کی دعائیں لے،ان کا مقام بہت ادب کا ہے۔جب تک ماں باپ زندہ ہیں،اور آدمی کو اُن کی سرپرستی حاصل ہے،اُس وقت تک آدمی کیلئے بھلائی ہی بھلائی ہے۔

جو لوگ صبح اُٹھ کر ماں باپ کی صورت دیکھتے ہیں اُن کے سب گناہ معاف ہوجاتے ہیں جو آدمی والدین کا حکم مانتا ہے اور اُنھیں خوش رکھتا ہے وہ نیک اور خوش قسمت انسان ہے۔

(۷) جلد بازی اور غرور سے بچو۔ صبر اور شکر سے کام لو:- داستان ''سب رس'' سے ماخوذ ساتویں اقتباس میں وجہی کہتے ہیں کہ خدا کو دو باتیں پسند نہیں ہیں۔ ایک جلد بازی دوسرے گھمنڈ اور غرور۔ اچھا آدمی وہی ہے جس میں انکساری اور صبر کا مادہ ہو۔ جلد بازی سے نقصان ہوتا ہے۔ صبر کرنے والے کو اچھا صلہ ملتا ہے۔ جلد بازی سے کام بگڑ جاتے ہیں، صبر سے کام بنتے ہیں۔ صبر اور شکر ہر درد کی دوا اور ہر مصیبت کا علاج ہیں۔ اللہ صابر اور شکر گذار بندوں پر مہربان ہوتا ہے۔

(۸) عقل کی فضیلت :- داستان ''سب رس'' سے ماخوذ آٹھویں اقتباس میں مُلّا وجہی عقل کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ عقل نور ہے اس کی پہنچ بہت دور تک ہے۔ عقل کی وجہ سے آدمی خدا کو پاتا ہے۔ اچھے بُرے کی تمیز کرتا ہے۔ کہیں سردار بنتا ہے تو کہیں وزیر۔ عقل کی بدولت دولت حاصل کی جاتی ہے۔ دنیا کے کاروبار چلائے جاتے ہیں، عقل دل کی رہنمائی کرتی ہے، عقل کے بغیر کچھ بھی نہیں۔ اس دنیا میں عقلمند ہی خوش رہے گا۔

مرکزی خیال :- مُلّا وجہی داستان ''سب رس'' کے ان اقتباسات کے ذریعہ لوگوں کو اخلاقی باتیں بیان کرتے ہیں۔ داستان نگار اپنا یہ فریضہ سمجھتا ہے کہ وہ کہانی سنانے کے ساتھ لوگوں کو اچھی بات بھی سنائے۔ تاکہ لوگوں کے اخلاق سدھر سکیں اور وہ بہتر انسان بنتے ہوئے دنیا اور آخرت کی کامیابی حاصل کر سکیں۔ ان اقتباسات میں کردار سازی کے اچھے گُر بتائے گئے ہیں۔ اس طرح داستان ''سب رس'' میں کہانی کے علاوہ لوگوں کی کردار سازی کا بھی اچھا مواد موجود ہے۔

مختصر سوال جواب:

سوال: داستان کسے کہتے ہیں۔

جواب: قدیم قصوں اور کہانی کو داستان کہتے ہیں۔ داستانیں طویل ہوتی ہیں۔ ان میں کئی کہانیوں کو جوڑا جاتا ہے۔ خواب وخیال کی باتیں، سحر جادو، جن دیو، بھوت پریت کے ذریعہ غیر معمولی باتوں کو داستان میں پیش کیا جاتا ہے۔ شر پر خیر کی فتح دکھائی جاتی ہے۔ مافوق الفطرت عناصر اور خیالی کہانیاں داستان کی اہم خوبیاں ہیں۔ داستان امیر حمزہ، الف لیلیٰ، سب رس، بیتال پچیسی، قصہ حاتم طائی، داستاں امیر حمزہ وغیرہ مشہور داستانیں ہیں۔

سوال: وجہی کا تعارف بیان کیجئے۔

جواب: مُلّا وجہی قطب شاہی دور کے مشہور شاعر اور داستان نگار تھے۔ اُنہوں نے 1045ھ 1635ء میں اُردو کی پہلی نثری داستان ''سب رس'' لکھی۔ اس داستان میں تمثیل نگاری سے کام لیا گیا۔ اور عشق، عقل، حسن اور دل، حُسن، نیکی، بدی وغیرہ کیفیات کو متحرک کرداروں کی شکل میں پیش کیا گیا۔ داستان ''سب رس'' میں قصہ حسن و دل پیش کیا گیا۔ درمیان میں وجہی فلسفیانہ باتیں اور زندگی سے متعلق فکر انگیز باتیں بیان کرتے ہیں۔ داستان کا اسلوب مقفیٰ و مسجع ہے۔ داستان کے ایک حصہ میں وجہی نے اخلاقی اور اصلاحی باتیں بیان کی ہیں۔

نصوح اور سلیم سے گفتگو

از: (ڈپٹی نذیر احمد)

سوال۔ ناول کسے کہتے ہیں؟ ناول کے اجزائے ترکیبی بیان کیجیے۔

ناول کی تعریف :داستانوں کے بعد اردو کے افسانوی ادب میں جو صنف شروع ہوئی، اسے ناول کہتے ہیں۔ لفظ ناول فرانسیسی لفظ ''Noves'' اور لاطینی لفظ ''Novelles'' سے نکلا ہے۔ جس کے معنی ''نئے کے'' ہیں۔ ناول ایک بیانیہ طویل کہانی ہوتی ہے۔ جس میں زندگی کا تفصیلی بیان ہوتا ہے۔ زندگی کا بیان ناول کی اہم خصوصیت ہے۔ اس میں حقیقی زندگی کی تصویر پیش کی جاتی ہے۔ خیالی باتوں کو اس میں کوئی جگہ نہیں دی جاتی۔ ناول میں کہانی، پلاٹ، کردار، زماں و مکاں وغیرہ اجزائے ترکیبی ہوتے ہیں۔ جن کی مدد سے ایک ناول تشکیل پاتا ہے۔ اردو میں ناول نگاری کا آغاز 18 ویں صدی کے آخر سے ہوا۔

ناول کے اجزائے ترکیبی۔ موضوع :ناول میں زندگی کا بیان ہوتا ہے۔ ناول اور ہر قسم کا دوسرا ادب اپنے عہد کی عکاسی کرتا ہے۔ اردو میں 19 ویں صدی کے اواخر میں لکھنے کا رواج شروع ہوا۔ نظیر احمد نے اخلاقی موضوعات پر ناول لکھے۔ پریم چند نے اپنے ناولوں میں گاؤں کی زندگی کو موضوع بنایا۔ سرور اور سرشار نے تہذیبی ناول لکھی۔ بعد کے دور میں ناول کے موضوعات میں وسعت پیدا ہوئی زندگی کے مسائل، عشق، دوستی، وطن سے محبت اور دیگر زندگی کے موضوعات پر ناول لکھے گئے۔ اس طرح زندگی کا رخ جیسا رہا اس دور میں ناولوں کے موضوعات ویسے ہی بدلتے رہے۔

پلاٹ :ناول کی کامیابی کا انحصار اس کے مربوط پلاٹ پر ہوتا ہے۔ ناول میں واقعات کی ترتیب کو پلاٹ کہتے ہیں۔ جس طرح مکان بسانے کے لیے منصوبہ بندی کی جاتی ہے۔ اسی طرح ناول میں بھی زندگی کے واقعات کو ترتیب سے جوڑ کر کہانی کو آگے بڑھایا جاتا ہے۔ اگر ایک انسان کی طویل زندگی کا بیان ہو تو اس کے بچپن، جوانی اور بڑھاپے کو ترتیب وادبیات کیا جائے گا اور اسی مناسبت سے واقعات پیش ہوں گے۔ بچپن میں انسان تجربے کار انسانوں کی طرح باتیں نہیں کرے گا۔ ناول نگار اس کی باتوں سے بچپن دکھائے گا۔ پلاٹ دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک سادہ پلاٹ جس میں ایک ہی قصہ آگے بڑھتا ہے، دوسرا پیچیدہ پلاٹ جس میں ضمنی قصے اصل کہانی کے ساتھ جڑ کر آگے بڑھتے ہیں۔ پریم چند کے ناولوں میں مربوط پلاٹ ملتا ہے۔

کردار :ناول میں کرداروں کا ہونا لازمی ہے۔ چوں کہ ناول میں زندگی بیان ہوتی ہے اور زندگی کے بیان میں زندہ انسانوں کا ذکر ضروری ہے۔ ناول میں ایک یا دو مرکزی کردار ہوتے ہیں اور ان کے اطراف کہانی کی مناسبت سے کردار شامل ہوتے جاتے ہیں۔ کردار اپنی بات چیت اور حرکت و عمل سے ناول میں اپنا تعارف کراتا ہے۔ اچھا کردار وہ ہے جو خود سے آگے بڑھے اور اپنے جذبات واحساسات سے ناول میں جان ڈالا ہے۔ اردو ناول میں کئی کردار مشہور ہوئے۔ پریم چند کے ناول ''گاؤدان'' میں ''ہوری'' کا کردار اہم ہے۔ نظیر احمد کے ناول ''بین الوقت'' میں ''ابن الوقت'' کا کردار اہم ہے۔ اسی طرح اردو ناولوں میں فوجی، آزاد، عمراؤ جان وغیرہ مشہور کردار ہے۔ ناول میں خیر اور شر کے کردار پائے جاتے ہیں۔ اس سے کہانی آگے بڑھتی ہے۔

مکالمے :ناول کا ایک اہم جز کرداروں کے مکالمے ہوتے ہیں۔ کرداروں کے مکالمے سے ناول کی کہانی آگے بڑھتی ہے۔ ناول میں اچھی

مکالمہ نگاری وہی سمجھی جائے گی جس میں کردار اپنی تعلیم اور اپنی تہذیب وعلاقے کے اعتبار سے گفتگو کرتے ہو۔ اگر منظر شمالی ہند کے دیہات کا ہوتو اس ناول کے کردار دیہاتی گفتگو کریں گے۔ تعلیمی یافت شخص معیاری زبان میں بات کرے گا۔ مکالمے چھوٹے ہوں تو اچھا ہے۔

منظر نگاری :ناول میں زندگی کا بیان ہوتا ہے۔ زندگی میں کچھ کردار ہوتے ہیں۔ یہ کردار اپنی زندگی کا کوئی واقعہ بیان کرتے ہیں۔ یہ واقعہ گھر، بازار، دیہات، گاؤں یا شہر میں ہوتا ہے ناول نگار میں اچھا تاثر پیش کرنے کے لیے واقعہ کی منظر نگاری کرنی پڑتی ہے۔ ناول میں چوں کہ قصہ زیادہ وقت پر محیط ہوتا ہے اس لیے اس کے مناظر میں سردی، گرمی، بارش اور دیگر مناظر پیش کرنے پڑتے ہیں۔ منظر کے اعتبار سے کرداروں کی نقل وحرکت بیان کرنا چاہیے۔ جیسے گرمی کا موسم ہوتو لوگ ٹھنڈا پانی اور ٹھنڈی چیزوں کو استعمال کرتے ہوئے نظر آئیں گے۔ بارش کے منظر کے بعد دکھائی دینے والے مناظر پیش ہوں۔ اس طرح موقع کے مناسبت سے منظر نگاری ہوتو ناول کامیاب سمجھا جاتا ہے۔

دیگر خصوصیات :ناول میں زبان ومکان کا بھی لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ ناول میں کس علاقے کی تصویر پیش کی جارہی ہے۔ اس میں مناسبت یا Cell فون کا ذکر نہیں کیا جاسکتا۔ گاؤں میں بادشاہ کا محل نہیں دکھایا جاسکتا۔ اسی طرح لوگوں کے طور طریقے، رسم ورواج بھی زمانے کے مناسبت سے پیش ہونے چاہیے۔ ناول کی زبان بھی کہانی کی مناسب ہونی چاہیے۔ کردار گاؤں کے ہوں تو ان کے مکالمے بھی دیہاتی ہوں گے۔ ناول میں قصہ کو دلچسپ انداز میں بیان کرنا چاہیے۔ اس کے لیے ناول نگار کو زبان کا ماہر ہونا چاہیے۔ ناول کے آخر میں اس کا نظریہ حیات بھی پیش ہونا چاہیے۔ ناول پڑھنے سے کوئی سبق ملنا چاہیے۔ ناول کے یہ اجزائے ترکیبی ایک ناول کو کامیاب بناتے ہیں۔

سوال: اردو ناول کے ارتقاء پر تفصیل سے لکھئے؟

جواب: اردو ناول کا ارتقاء:- ناول انگریزی لفظ ہے انگریزی کے اثر سے ہمارے ادب میں مشہور ہوگیا۔ ناول میں ایسے نثری قصے ہوتے ہیں جس میں پلاٹ، منظم اور واضح ہو۔ خیالی کہانیوں کے بجائے زندگی کے معاملات واقعات اور مسائل بیان کئے جائیں یہ واقعات قدیم داستانوں کی طرح طویل نہ ہوں اور نہ اتنے مختصر کے چند جملوں میں بیان کئے جائیں۔ جدید ناول میں کردار نگاری اور زماں ومکان میں مناسبت کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔ اردو ناول سے پہلے قدیم داستانوں کا رواج تھا۔ الف لیلیٰ، طلسم ہوش ربا، بوستان خیال، باغ و بہار اور فسانہ عجائب مشہور داستانیں ہیں۔ یہ کافی طویل ہوا کرتی تھیں ان میں مافوق الفطرت عناصر اور خیالی واقعات ہوا کرتے تھے۔ داستانوں کا تعلق ہماری زندگی سے نہیں تھا۔ داستان سننے کے بعد زندگی کے مسائل سے دوچار انسان کچھ دیر کیلئے اپنا مسئلہ بھول کر داستان کے نشہ میں ڈوب جاتا تھا۔ لیکن جیسے ہی نشہ اترا زندگی کا مسئلہ اسکے سامنے اٹھ کھڑا ہوتا تھا۔ اس طرح داستانیں شاہی دور کی پیداوار تھیں۔ اور انیسویں صدی میں جبکہ زندگی مسائل سے دوچار تھی اس وقت ناول نگاری کو فروغ ملا اسطرح زندگی کا بیان ناول کی ضرورت قرار پایا انگریزی میں ''رچرڈسن'' اور فلڈنگ ناول کے موجد کہے جاتے ہیں۔ اردو میں نذیر احمد کو پہلا ناول نگار کہا جاتا ہے۔ نذیر احمد نے پہلی مرتبہ لڑکیوں کی تربیت کیلئے چند اصلاحی قصے لکھے۔ جن میں زندگی کا بیان تھا ان کے تحریر کردہ یہ قصے اردو ناول کے ابتدائی نقوش قرار پائے۔ نذیر احمد نے جو ناول لکھے وہ 'مراۃ العروس' 1869ء 'توبتہ النصوح' 'بنات النعش' ابن الوقت وغیرہ ہیں۔ نذیر احمد کے ناول اخلاقی اور مذہبی نقطہ نظر سے لکھے گئے اردو ناول کی تاریخ میں دوسرا بڑا نام پنڈت رتن ناتھ سرشار کا ہے۔ انہوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز اودھ پنچ اخبار سے کیا جس میں ان کا مشہور ناول فسانہ آزاد قسطوں میں شائع ہوا۔

اور سرشار اسی ناول کے بدولت اردو ادب میں مشہور ہیں۔لیکن یہ ناول بھی ناول کی تعریف پر پورا نہیں اترتا۔ یہ ایک آزاد فسانہ ہے اس میں نہ کوئی پلاٹ ہے نہ تسلسل۔ اسکی کردار نگاری بھی بناوٹی اور شاعرانہ ہے اس ناول میں لکھنو کی زندگی پیش کی گئی سرشار نے نوابوں کے دربار اور بیگموں کی زبان پیش کرتے ہوئے قصہ بیان کیا ہے اور مزاح نگاری سے ناول میں دلچسپی پیدا کی ہے۔

سرشار کے بعد اردو کے اہم ناول نگار عبدالحلیم شرر ہیں جنہیں اردو میں تاریخی ناول نگاری سے شہرت ملی۔ان کے مشہور تاریخی ناول فردوس بریں منصور موہنا' ملک العزیز ورجنا' ایام عرب' فتح اندلس (اسپین) اور فلورا فلورنڈا وغیرہ ہیں۔ناول فردوس بریں کو کافی شہرت ملی اس ناول کا کردار شیخ علی وجودی کردار نگاری کا اچھا نمونہ ہے۔شرر انگریزی سے واقف تھے انہوں نے انگریزی ناولوں کا مطالعہ کیا اور تاریخی قصوں کو ادبی انداز میں پیش کیا۔انکے ناولوں میں پلاٹ میں ترتیب اور دلچسپی پائی جاتی ہے شرر اور سرشار کے معاصر ایک اہم ناول نگار منشی سجاد حسین ہیں یہ اودھ پنچ کے ایڈیٹر تھے۔اس زمانے میں اودھ پنچ کے ذریعہ طنز وظرافت کو فروغ حاصل ہورہا تھا۔ان کے دو ناول ''حاجی بغلول اور احمق الذین'' مشہور ہیں۔

منشی سجاد حسین سرسید کی اصلاحی تحریک کے مخالف تھے۔چنانچہ انہوں نے اپنے ناولوں کے کرداروں کے ذریعہ سرسید کا مذاق اُڑایا اور لوگوں کیلئے ہنسی کا سامان فراہم کیا۔سجاد حسین کا ایک ناول ''طرح دار لونڈی'' ہے انکے دیگر ناول ''میٹھی چھری کا یا پلٹ' شیخ چلی' پیاری دنیا'' وغیرہ ہیں۔نذیر احمد کی قائم کردہ روایات کو راشد الخیری نے آگے بڑھایا۔انہوں نے اپنے ناولوں میں خواتین کی مظلومی اور بے جا رسومات کے خلاف آواز اٹھائی۔انکے ناولوں کے نام ''صبح زندگی شام زندگی' سیلاب اشک' جوہر عصمت' بنت الوقت' نانی ہشو' بنیان میلہ' وداع خاتون' شب زندگی اور ماہ عجم'' ہیں۔راشید الخیری کو مصور غم اور مصور الم کہا جاتا ہے۔اس دور کے دیگر ناول نگاروں میں سجاد حسین کسمنڈوی محمد علی طیب' قاری سرفراز حسین عربی وغیرہ ہیں۔اسکے فوراً بعد مرزا ہادی رسوؔا کے ناول ''امراؤ جان ادا' کو شہرت حاصل ہوئی۔ یہ ناول 1899ء میں شائع ہوا۔کہنے کو تو اس ناول میں امراؤ جان نامی ایک لکھنوی طوائف کا قصہ ہے تاہم اس ناول کے ذریعہ لکھنو کے انحطاط پذیر معاشرہ اور وہاں کی تہذیب جذبات انسانی کی مصوری اور انسانی نفسیات کو فنی کمال کے ساتھ پیش کیا گیا۔اس ناول کا طرز تحریر صاف واضح اور رواں ہے۔''امراؤ جان ادا'' کو اُردو میں نفسیاتی ناول کا پہلا کامیاب نمونہ قرار دیا جاتا ہے۔ یہ ناول فن اور تکنیک کے اعتبار سے ایک مکمل ناول ہے۔مرزا ہادی رسوا کے دیگر ناول افشائے راز' اختری بیگم' ذات شریف' اور شریف زادہ ہیں۔قاضی سرفراز حسین نے رسوؔا کے طرز پر 1898ء میں ایک ناول ''شاہد رانا'' لکھا ہے۔ جسے امراؤ جان ادا کے مماثل قرار دینے کی کوشش کی ہے اُسی دور کے ایک ناول نگار مرزؔا سعید ہیں جن کے ناول ''خواب ہستی'' 1905ء اور ''یاسمین'' 1908ء میں زندگی کے معاشرتی بحران کو پیش کیا گیا۔

انیسویں صدی کے آخری نصف میں حقیقت نگاری ادب کا بنیادی وصف رہا۔ایک عرصہ تک ناولوں میں زندگی کے مسائل پیش ہوتے رہے۔اس کے ردِعمل کے طور پر پھر ایک مرتبہ ادب میں خواب وخیال کی دنیا بسائی جانے لگی اور ''ادب برائے زندگی'' نظریہ کو چھوڑتے ہوئے ''ادب برائے ادب'' کے تحت جو ادب لکھا گیا اُسے ''ادب لطیف'' کہا گیا اور اُس دور کے ادب میں رومانس کو جگہ دی گئی۔سجاد حیدر یلدرم اور نیاز فتح پوری نے ترجموں اور ناولوں اور افسانہ کے ذریعہ رومانیت کو فروغ دیا۔1913ء نیاز فتح پوری ایک شاعر کا انجام اور شہاب کی سرگزشت ناول شائع کیا جو رومانی طرز پر لکھے گئے اسی طرز کا ایک ناول ''شاما'' کے عنوان سے

کرشن پرشاد کور نے 1919 خاف کی پری کے عنوان سے علی عباس حسینی نے لکھا۔ رومانیت کا دور بہت مختصر تھا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد دنیا میں زندگی ایک مرتبہ پھر مسائل سے دوچار ہوجاتی ہے ہندوستان میں گاندھی جی کے زیر قیادت آزادی کے تحریک زور پکڑنے لگتی ہے ایسے ماحول میں اُردو ناول نگاری ایک مرتبہ پھر حقیقت نگاری کا رُخ اختیار کرتی ہے اور پریم چند ایک عہد ساز ناول نگار کے طور پر اُبھر کر سامنے آتے ہیں۔ پریم چند نے اپنے ناولوں میں ہندوستانی دیہاتوں کی سچی تصویریں پیش کیں اور مظلوم مزدوروں کسانوں' زمینداروں' ٹھیکیداروں' اور مذہبی رہنماؤں کے ظلم کو اُجاگر کیا۔ انہوں نے ہندوستان کے دیہاتوں کے مقابل نئے وجود میں آرہے شہروں' مل مزدوروں اور ترقی کو پیش کیا۔ زندگی کی کشمکش اُن کے ناولوں میں مشترک نظر آتی ہے۔ انہوں نے اسرار معابد' ہم خرما وہم ثواب' جلوہ ایثار' بیوہ' بازار حسن' گوشۂ عافیت' نرملا' غبن' چوگان ہستی' پردہ مجاز' میدانِ عمل' گئودان اور منگل سوتر' نامی ناول لکھئے ۔گئودان کو کافی شہرت حاصل ہوئی۔

پریم چند کے دور کے ساتھ ہی اُردو فکشن میں ترقی پسندی کے رجحانات جڑ پکڑ رہے تھے دراصل روس کے اکتوبر انقلاب کے ساتھ ہی دنیا بھر میں اشتراکیت کے نظریہ کو فروغ حاصل ہوا۔ اور ہندوستان میں بھی ترقی پسندی کی بنیادیں پڑ چکی تھیں۔ اپریل 1936ء میں لکھنو میں پریم چند کی صدارت میں ترقی پسند تحریک کا پہلا اجلاس ہوا۔ اجلاس کی صدارت پریم چند نے کی۔ پریم چند نے اپنے صدارتی خطبہ میں ادب برائے زندگی کا نعرہ بلند کرتے ہوئے کہا کہ ''ہمیں اب ادب کا معیار بدلنا ہوگا' ترقی پسند ادیبوں نے اشتراکیت کے نظریات کی ترویج کرتے ہوئے مارکس اور فرائڈ کے نظریات سے بھی تاثر لیا اس دور کے ناولوں اور افسانوں میں کھلیعام عریاں نگاری کو فروغ دیا گیا۔ اور اُردو ناول نگاری کے اس موڑ پر اُردو افسانہ بھی اپنے بال و پر پھیلا چکا تھا۔

سوال (۱): ڈپٹی نذیر احمد کے ناول ''توبۃ النصوح'' کے اقتباس ''نصوح اور سلیم سے گفتگو'' کا خلاصہ لکھئے؟ (یا) نصوح اور سلیم کی گفتگو سے کونسے اخلاقی پہلو سامنے آتے ہیں انھیں اپنے الفاظ میں لکھئے؟

جواب۔ **ناول کی تعریف:-** لفظ ناول اطالوی زبان کے لفظ Novella اور انگریزی زبان کے لفظ Novel سے بنا ہے جس کے معنی انوکھا یا نرالے کے ہیں۔ ادب کی اصطلاح میں ناول ایسے طویل قصے کو کہتے ہیں جس میں زندگی کی حقیقتوں کو بیان کیا جاتا ہے۔ ناول کے اجزاء میں کہانی، پلاٹ، کردار اہم ہوتے ہیں۔ اُردو میں اُنیسویں صدی کے نصف سے انگریزی کے زیر اثر ناول نگاری کا آغاز ہوا۔ نذیر احمد، سرشار، سرور، سجاد حسین، پریم چند، کرشن چندر' انتظار حسین، قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی وغیرہ اُردو کے اہم ناول نگار ہیں۔ افسانے کے فروغ کے بعد ناول کی مقبولیت میں کمی آئی۔

ڈپٹی نذیر احمد کا تعارف:- ڈپٹی نذیر احمد (1836-1912) اُردو کے اولین ناول نگار ہیں۔ سرسید کی اصلاحی تحریک میں شامل ہوکر اُنھوں نے اپنے بچوں کیلئے جو اخلاقی قصے لکھے وہ اُردو ناول کے اولین نقوش ثابت ہوئے۔ نذیر احمد کے ناولوں میں مراۃ العروس، بنات النقش، توبۃ النصوح، ابن الوقت، رویائے صادقہ فسانہ مبتلا وغیرہ ہیں۔ نذیر احمد نے ناول توبۃ النصوح میں بچوں کی اخلاقی تربیت پر زور دیا ہے۔ ناول میں تین کردار اہم ہیں۔ باپ نصوح اور اُس کی اولاد کلیم اور سلیم ہے۔ باپ ایک عمر گزرنے کے بعد اپنے بچوں کی تربیت کی کوشش کرتا ہے اور اپنی کوشش میں ناکام رہتا ہے۔ یہی اس ناول کا مرکزی کردار ہے۔ ناول سے ایک اقتباس ''نصوح کی سلیم سے گفتگو'' مطالعہ

ادب حصہ دوم میں شامل کیا گیا ہے۔جس کا خلاصہ اس طرح ہے۔

خلاصہ:- ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے ناول ''توبۃ النصوح'' کے اس حصے میں نصوح کی اپنے چھوٹے بیٹے سلیم سے گفتگو کو بیان کیا ہے۔سلیم کلیم کا چھوٹا بھائی ہے۔وہ اپنے بڑے بھائی کی بُری عادتوں سے پریشان رہتا ہے اور محلے کے نیک لڑکوں کی صحبت میں رہتے ہوئے کھیل کود سے دور ہوتا ہے۔سلیم کی عمر دس برس کی ہے۔اک دن صبح سویرے اُس کے والد اوپر بالا خانے پر اُسے بلاتے ہیں۔سلیم ڈرتے ڈرتے اوپر جاتا ہے۔باپ کو سلام کر کے الگ ٹھہر جاتا ہے۔باپ اُسے پیار کرتے ہوئے اُس کی تعلیمی مصروفیات کا حال پوچھتا ہے اور شطرنج اور گنجفہ کھیلوں میں اس کی دلچسپی کے بارے میں پوچھتا ہے۔سلیم کہتا ہیکہ اُسے سارے ہی کھیل ناپسند ہیں۔باپ اس کی وجہ دریافت کرتا ہے تو سلیم اپنے محلے کے ایک گھرانے میں اُس کے جانے اور اُس گھر کے نیک لڑکوں کی صحبت میں رہنے کو اپنے کھیلوں سے ناپسندیدگی کی وجہ قرار دیتا ہے اور تفصیلی طور پر اُن لڑکوں کی عادات اور گھر کے احوال سناتا ہے کہ چار لڑکے اس محلے میں کئی برس سے رہتے ہیں۔نظر نیچی کئے راستہ چلتے ہیں۔کسی سے لڑتے نہیں،کسی کو گالی نہیں دیتے اور نہ جھوٹ بولتے ہیں۔وہ میرے مدرسے میں پڑھتے ہیں۔یہ لڑکے دوپہر کی چھٹی میں نماز کو جاتے ہیں۔منجھلا لڑکا میرا ہم جماعت ہے۔اک دن مجھے آموختہ یاد نہ تھا۔استاد نے مجھے کہا کہ میں اس لڑکے کے گھر جا کر سبق یاد کرلوں۔میں نے اس لڑکے سے گھر آنے کی اجازت چاہی تو اُس نے ہاں کہہ دیا۔میں اس لڑکے کے گھر گیا۔گھر میں ایک بزرگ خاتون جائے نماز پر بیٹھی کچھ پڑھ رہی تھیں۔وہ لڑکوں کی نانی تھیں۔اُنھوں نے اپنی عبادت کے بعد مجھے سلام کرنے کی تلقین کی۔مجھے مٹھائی دی۔میں روز اُن کے گھر جانے لگا۔وہ مجھے اچھی باتوں کی نصیحتیں کرنے لگیں۔ایک دن گلی میں میری ایک لڑکے سے لڑائی ہوگئی۔میں نے اس لڑکے کو گالی گلوچ بھی کیا۔نانی نے یہ منظر دیکھا اور افسوس کا اظہار کیا کہ میں اُن کی نصیحتیں سن کر بھی درست نہیں ہوا۔اُنھوں نے اس ڈر کا اظہار کیا کہ کہیں میری محبت سے اُن کے نواسے بگڑ نہ جائیں۔میں نے سمجھانے کی کوشش کی کہ لڑائی لڑکے نے شروع کی۔تب میں نے جواب دیا۔نانی نے کہا کہ تم بازاری لڑکوں سے دور رہو تو بہتر ہوگا۔اس طرح لڑائی جھگڑے کرنے سے عزت جاتی ہے۔نانی کی باتیں سُن کر میں بہت شرمندہ ہوا۔میں رونے لگا۔اور آئندہ کبھی نہ لڑنے کا عہد کیا۔اس کے بعد بھی مہینوں میں اُن کے گھر جاتا رہا۔نانی روز آنہ کچھ نہ کچھ نصیحتیں کرتی تھیں۔اک دن اُنھوں نے صبح سے شام تک میری مصروفیات کا حال پوچھا۔جس میں نماز اور عبادت کا ذکر نہیں تھا۔یہ سن کر اُنھوں نے کہا کہ دن اور رات کے آٹھ پہر میں ایک مرتبہ بھی خدا کو یاد نہیں کرتے ہو۔افسوس کی بات ہے اُنھوں نے کہا کہ خدا نے تمہیں انسان بنایا۔اگر جانور بناتا تو کیا کرتے۔پھر انسان بھی صحیح سلامت بنایا،لنگڑا لولا نہیں بنایا۔اس لئے تمہیں خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے۔اُنھوں نے مجھے نماز سکھائی اور اس کے معنی سمجھائے۔میں کئی روز تک ان کے گھر جاتا رہا۔لیکن اب نہیں جارہا ہوں جس کا مجھے افسوس ہے اس طرح سلیم نے کھیلوں سے اپنی دوری کی وجہ سنائی۔

مرکزی خیال:- سلیم کی اپنے والد سے گفتگو اور نانی کے ذریعہ اس کی تربیت کی باتیں پیش کرتے ہوئے نذیر احمد نے تمام والدین کو یہ سبق دیا کہ وہ بچوں کی بچپن میں مناسب تربیت کریں۔انھیں کھیل کود اور بُری عادتوں سے بچائیں۔انھیں نماز سکھائیں۔سچ بولنے کی عادت ڈالیں۔لڑائی جھگڑے سے دور رکھیں۔تب ہی وہ بڑے ہوکر والدین کے فرماں بردار ہوں گے۔اور نیک بنیں گے۔یہی اس ناول کا مرکزی خیال ہے۔

مختصر سوال جواب

سوال: ناول کسے کہتے ہیں۔

جواب: لفظ ناول اطالوی زبان کے لفظ Novella اور انگریزی زبان کے لفظ Novel سے بنا ہے جس کے معنی انوکھا یا نرالے کے ہیں۔ ادب کی اصطلاح میں ناول ایسے طویل قصے کو کہتے ہیں جس میں زندگی کی حقیقتوں کو بیان کیا جاتا ہے۔ ناول کے اجزاء میں کہانی، پلاٹ، کردار اہم ہوتے ہیں۔ اُردو میں اُنیسویں صدی کے نصف سے انگریزی کے زیر اثر ناول نگاری کا آغاز ہوا۔ نذیر احمد، سرشار، سرور، سجاد حسین، پریم چند، کرشن چندر، انتظار حسین، قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی وغیرہ اُردو کے اہم ناول نگار ہیں۔ افسانے کے فروغ کے بعد ناول کی مقبولیت میں کمی آئی۔

سوال: ڈپٹی نذیر احمد کا تعارف بیان کیجئے۔

جواب: ڈپٹی نذیر احمد (1836-1912) اُردو کے اولین ناول نگار ہیں۔ سرسید کی اصلاحی تحریک میں شامل ہو کر اُنھوں نے اپنے بچوں کیلئے جو اخلاقی قصے لکھے وہ اُردو ناول کے اولین نقوش ثابت ہوئے۔ نذیر احمد کے ناولوں میں مراۃ العروس، بنات النعش، توبۃ النصوح، ابن الوقت، رویائے صادقہ فسانہ مبتلا وغیرہ ہیں۔

سوال: ''نصوح اور سلیم کی گفتگو'' نذیر احمد کے کس ناول کا حصہ ہے۔

جواب: ''نصوح اور سلیم کی گفتگو'' نذیر احمد کے ناول توبۃ النصوح کا حصہ ہے۔

انشائیہ ذوق چائے نوشی از: ابوالکلام آزاد

سوال (ا): ابوالکلام آزاد کے انشائیہ ''ذوق چائے نوشی'' کا خلاصہ لکھئے؟

جواب: انشائیہ کی تعریف:- انشائیہ نثری صنف ہے۔ ہلکے پھلکے مضمون کو انشائیہ (Light Essay) کہتے ہیں۔ انشائیہ زندگی کے کسی بھی موضوع پر لکھی ہوئی ایسی تحریر ہوتی ہے جس میں لکھنے والے کے جذبات اور اس کا انداز بیان شامل رہتا ہے۔ اُردو میں فرحت اللہ بیگ، خواجہ حسن نظامی اور ابوالکلام آزاد، مولوی عبدالحق، شوکت تھانوی، مشتاق احمد یوسفی وغیرہ مشہور انشائیہ نگار گزرے ہیں۔

ابوالکلام آزاد کا تعارف:- مولانا ابوالکلام آزاد (1888-1958) نامور سیاست داں بے باک صحافی، ممتاز عالم دین، مفسر قرآن، خطیب اور انشاء پرداز گزرے ہیں۔ جدوجہد آزادی کے سلسلہ میں انھیں احمد نگر کی جیل میں قید کیا گیا تھا۔ جہاں سے اُنھوں نے اپنے دوست حبیب الرحمٰن شیروانی کو کئی خطوط لکھے۔ یہ خطوط ادبی اہمیت کے حامل تھے۔ بعد میں یہ خطوط ''غبار خاطر'' کے نام سے شائع ہوئے۔ جس میں سے ایک خط کا متن ''ذوق چائے نوشی'' کے نام سے شامل نصاب کیا گیا ہے جس کا خلاصہ اس طرح ہے۔

انشائیہ ''ذوق چائے نوشی'' کا خلاصہ:- ابوالکلام آزاد اپنے انشائیہ کے آغاز میں لکھتے ہیں کہ وہ ہمیشہ صبح 3، 4 بجے اُٹھ جایا کرتے تھے۔ اُن کے مطابق صبح کا وقت اُن کیلئے بڑا سہانا اور پُر کیف وقت ہوا کرتا تھا۔ آزاد لکھتے ہیں کہ مجھے صبح میں چائے پینے کی عادت

ہے۔لیکن قید میں اُنھیں سلیقہ سے چائے پیش کرنے والا کوئی نہیں تھا۔اس لئے وہ خود ہی چینی چائے کے ذریعہ بڑی ہنرمندی سے اپنے لئے چائے بناتے ، روسی فنجان میں کرسی پر بیٹھ کر آہستہ آہستہ چائے پیتے اور سرور حاصل کرتے اور اسی کیفیت میں وہ لکھنے لگتے۔آزاد کہتے ہیں کہ دوپہر کے وقت بھی اُن کیلئے اچھا وقت ہوتا جب وہ لکھتے لکھتے تھک جاتے تو تھوڑی دیر آرام کر لیتے اور پھر چائے پی کر اپنی مصروفیت میں لگ جاتے۔جیل میں باہر کی زندگی کا سا آرام نہیں ہوتا ہے۔اس کے باوجود وہ نیلے آسمان اور چمکتے سورج کو دیکھ کر غور وفکر میں لگ جاتے۔اور اکثر ان کے قلم سے فلسفیانہ باتیں نکل پڑتیں۔چنانچہ اس مضمون میں وہ زندگی کا فلسفہ بیان کرنے لگتے ہیں۔وہ کہتے ہیں کہ اکثر لوگ اس کوشش میں رہتے ہیں کہ زندگی میں کوئی بڑا کام کریں۔لیکن یہ لوگ نہیں جانتے کہ زندگی کو صحیح ڈھنگ سے گزارنا بڑا کام ہے۔اس لئے وہ کہتے ہیں کہ زندگی کو ہنسی خوشی گزارنا چاہئے۔یہاں مرنا آسان ہے۔اور جینا مشکل اور اگر کوئی جینے کا ڈھنگ سیکھ لے تو وہ کامیاب انسان ہے۔اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے آزاد قدیم چینیوں کے ایک مقولہ کا ذکر کرتے ہیں جس میں سوال کیا گیا تھا کہ سب سے زیادہ دانش مند کون ہے؟ اور اس کا یہ جواب دیا گیا کہ جو سب سے زیادہ خوش رہتا ہے وہی دانش مند ہے۔آزاد کے مطابق یہ خیال صحیح ہے۔چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ خوش رہنا ایک ہنر ہے۔جو یہ ہنر سیکھ لے اُس نے زندگی کا سب سے بڑا کام سیکھ لیا۔اب یہ نہیں دیکھا جائے گا کہ اس نے زندگی میں کیا کیا نہیں کیا۔چنانچہ وہ زور دے کر کہتے ہیں۔آپ خود خوش رہئے۔دوسروں کو بھی خوش رکھئے۔اپنے چہرہ کو غمگین نہ بنائیے۔فرانسیسی ادیب آندرے زید نے کہا کہ خوش رہنا ہماری طبعی ضرورت ہی نہیں بلکہ اخلاقی ذمہ داری ہے۔ہم سماج میں رہتے ہیں، ہماری زندگی آئینہ کی طرح ہے۔جس میں کئی لوگوں کا عکس پڑتا ہے۔ہم تنہا نہیں رہتے۔سمندروں کی لہروں کی طرح، ہمارے ساتھ گھر، خاندان اور سماج کے افراد لگے ہوئے ہیں۔ہماری خوشی اور غم کا اثر لازمی طور پر اُن پر پڑتا ہے۔چنانچہ ہمیں خوشی کو بانٹنا چاہئے اور سماج میں ایک صحت مند مثبت رویہ کو پروان چڑھانا چاہئے۔

مرکزی خیال :- ابوالکلام آزاد اس انشائیہ میں کہتے ہیں کہ چائے نوشی کے بعد انسان فلسفیانہ باتیں سوچنے اور کہنے لگتا ہے۔چنانچہ وہ زندگی کا فلسفہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ زندگی میں خوش رہنا اور دوسروں کو خوش کرنا بڑا کام ہے۔

سوال: مولانا ابوالکلام آزاد کی علمی وادبی خدمات پر نوٹ لکھو؟

جواب: ہندوستان کی قومی تحریک نے جن عظیم ترین دانشوروں کی تربیت کی ان میں مولانا ابوالکلام آزاد کا مقام بہت بلند ہے۔مولانا ابوالکلام آزاد (1888-1958) نامور سیاست داں بے باک صحافی، ممتاز عالم دین، مفسر قرآن، خطیب' عالم دین، صحافی، سیاسی رہنما اور صاحب طرز ادیب تھے۔وہ ہندوستان کی جدوجہد آزادی کے عظیم رہنما اور ہندوستانی مسلمانوں کی آبرو کی منفرد علامت تھے۔جس تیزی سے آزاد کی شخصیت کا ارتقاء ہوا اس کی مثال بیسویں صدی کے نصف اول میں کسی اور عالم وسیاسی لیڈر کی نہیں ملتی۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے شروع میں کئی نام بدلے۔والد محترم مولوی خیرالدین نے محی الدین احمد نام رکھا۔لیکن آپ نے 1900 میں ''خدنگ نظر'' میں اپنا نام غلام محی الدین آزاد لکھا۔دوسال بعد ''مخزن'' میں ابوالکلام محی الدین آزاد چھپا۔کبھی اپنے آپ کو 'احمد المکنی بابی الکلام آزاد الدہلوی'، کبھی صرف 'احمد'، کبھی 'ابوالکلام'، کبھی 'ابوالکلام احمد' لکھا۔لیکن 1903 میں جب انہوں نے 'لسان الصدق' کی صدارت سنبھالی تو اپنا نام ابوالکلام آزاد لکھا اور یہی نام عمر بھر ساتھ رہا۔

مولانا آزاد کی جدوجہد تین ادوار میں منقسم نظر آتی ہے۔پہلا دور 1906 سے 1915 تک کا ہے۔اس میں آزاد اردو ادب وصحافت کے مطلع

پر ایک مسلم محبّ وطن کی حیثیت سے نمودار ہوئے۔اس زمانہ میں آپ پر ایک ہی جذبہ حاوی تھا اور وہ تھا مغربی استعمار کی ریشہ دوانیوں کے خلاف اتحاد اسلامی کو مضبوط کرنا اور روشن خیالی و معقولیت پر اسلام کے احیاء کی بنیاد رکھنا۔دوسرا دور 1920 سے 1923 تک محیط ہے۔اس دور میں مولانا آزاد نے خلافت تحریک کے رہنما اور مفکر کی حیثیت سے شہرت حاصل کی۔آپ نے مہاتما گاندھی کی طرح سول نافرمانی اور ستیہ گرہ کے لیے عوام کو منظّم کیا۔آزاد غالبًا پہلے شخص تھے جنہوں نے انگریز حکومت سے عدم تعاون کے پروگرام پر گاندھی جی کی پوری حمایت کی۔تیسرا دور 1923 سے 1958 تک کا ہے۔اس دور میں مولانا آزاد متحدہ تہذیب اور سیکولر قومیت کی اقدار کے زبردست مبلغ اور محافظ نظر آتے ہیں۔

ہمارا ملک ہندوستان اگر سانحہء تقسیم کے باوجود سیکولرزم کی راہ پر گامزن رہا تو اس کا سہرا بڑی حد تک مولانا کے سر جاتا ہے۔مولانا کی قیادت، ان کے تدبر، ان کی شخصیت میں مرکوز ہندوستانی امتزاج اور ان کی مشترکہ تہذیب کی زندہ جاوید علامت ہونے کی بدولت ہی ہندوستان سیکولر بنا رہا۔اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ ایک ایسے دانشور تھے جس کی نگاہِ دوررس نے بھانپ لیا تھا کہ ملک کی تقسیم کسی طرح بھی مسلمانوں کے لئے سودمند نہ ہوگی۔اگر ملک کا بٹوارہ ہوا تو مسلمان ہندوستان میں ایک کمزور اقلیت بن کر رہ جائیں گے اور اکثریت کے رحم وکرم پر زندگی گزاریں گے۔یقین نہیں آتا کہ مولانا نے جس وقت صحافت میں قدم رکھا ان کی عمر محض گیارہ سال تھی۔ان کی صحافت کا آغاز ''نیرنگ عالم'' سے ہوا۔لیکن صحیح معنی میں ان کی صحافتی زندگی کا آغاز اس وقت سے ہوتا ہے جب انہوں نے ''لسان الصدق'' کی ادارت سنبھالی۔لوگ حیران تھے کہ چودہ برس کا نوجوان اتنے موقر ادبی رسالہ کا مدیر ہے! لیکن آزاد کی بطور صحافی تمام تر شہرت ''الہلال'' اور ''البلاغ'' سے ہوئی۔ ''الہلال'' اردو کا پہلا باتصویر ہفتہ وار رسالہ تھا۔چونکہ آپ ادب کی راہ سے صحافت میں آئے تھے، اس لئے صحافت پر ادبی رنگ ہمیشہ غالب رہا۔ان کی تحریروں میں قرآن کی دعوت وخطابت کا آہنگ تھا جس نے دلوں کو تڑپایا اور دماغوں کو متزلزل کیا۔مولانا آزاد کو اردو، فارسی، انگریزی اور بنگالی زبان پر زبردست قدرت حاصل تھی، جبکہ عربی آپ کی مادری زبان تھی۔دنیا نے آزاد کی صرف تحریروں کا ہی لوہا نہیں مانا بلکہ انہیں ایک بہترین مقرر کے طور پر بھی تسلیم کیا گیا۔آپ کی شخصیت اتنی ہمہ جہت تھی کہ آپ کے دور کی عظیم ہستیوں کو اس کا بخوبی علم تھا۔ بابائے قوم مہاتما گاندھی آپ سے بے حد متاثر تھے۔انھوں نے کہا تھا ''مجھے اب تک کوئی ایسا انسان نہیں ملا جو مولانا آزاد کے پایہء کمال تک پہونچتا ہو۔وہ ایک طاقتور، سچے اور بے خوف انسان تھے، انھوں نے ظلم اور ناانصافی کے خلاف لڑائی کی''۔

مولانا آزاد کو جب کانگریس کا صدر منتخب کیا گیا تو ان کی عمر محض 35 سال تھی۔آزاد ہند کے وہ پہلے وزیر تعلیم منتخب ہوئے اور وفات تک یہ قلمدان آپ کے پاس رہا۔آپ کے دور میں تعلیمی میدان میں کئی پیش رفت ہوئیں۔مثلاً یہ اصول تسلیم کیا گیا کہ صرف کتابی علم حاصل کرنے کا نام تعلیم نہیں ہے۔سائنسی اور تکنیکی تعلیم، اساتذہ کی ٹریننگ، لسانی تربیت، مندرجہ درج فہرست ذاتوں اور قبیلوں و دیگر پسماندہ طبقوں کے لئے وظیفوں کی اسکیمیں ان سب کا نفاذ انہی کی وزارت میں ہوا۔آپ نے تکنیکی تعلیم کی آل انڈیا کونسل از سرنو منظّم کی، یونیورسٹی گرانٹس کمیشن (یو جی سی) قائم کیا، ڈاکٹر رادھا کرشنن اور جواہر لعل نہرو کے ساتھ مل کر موسیقی، ادب اور آرٹ جیسی تین ممتاز اکادمیوں کے تصور کو عملی جامہ پہنایا۔آپ انڈین کونسل برائے تہذیبی تعلقات (آئی سی سی آر) کے بانی اور پہلے صدر تھے۔یہی نہیں بلکہ آپ کا تعلق یونیسکو سے کئی سال تک رہا اور دہلی میں 1956 میں یونیسکو کی جنرل کانفرنس کی صدارت کی۔آل انڈیا خلافت کمیٹی کے آپ صدر بھی منتخب ہوئے۔ ہندوستان میں مولانا آزاد کے نام سے بہت سی اکادمیاں، تحقیقی و تعلیمی ادارے، ٹرسٹ، ڈاک ٹکٹ اور بے شمار ادبی انجمنیں قائم ہیں۔حکومت

ہند نے انہیں 1992 میں بھارت رتن کے اعزاز سے نوازا۔

آزاد کی تصانیف میں ''تذکرہ''، ''غبار خاطر'' اور ''ترجمان القرآن'' کو بہت ہی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ پچھلی دو صدیوں میں جو تفسیریں لکھی گئیں ان میں مولانا کی ترجمان القرآن کا اہم مقام ہے۔ سرسید کی تفسیر کے بعد اردو میں یہ دوسری ایسی تفسیر ہے جس نے ہندوستان کے حالات اور جدید ہندوستانی ذہن کی ضرورتوں اور اس کے مسلمہ اقدار کو سامنے رکھ کر قرآن کے مطالب کو قاری کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی۔ ''تذکرہ'' کا موضوع دعوت و اصلاح ہے اور ''غبار خاطر'' کا ادب و انشاء ہے۔

آج مولانا آزاد کا احترام تو لوگ کرتے ہیں مگر ان کے پیغام اور تعلیم کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ ہندوستانی قومی تحریک کے عظیم رہنماؤں میں مولانا آزاد کی تعلیمات کو محض ادھورا سمجھا گیا ہے۔ عوام کی اکثریت کے سامنے ان کی حیثیت بس ایک قوم پرست مسلم رہنما کی ہے۔ آزاد کی قومی تحریک ایک جذباتی یادگار، نشانی، بھولی بسری وراثت کے طور پر تو باقی رہ گئی ہے جس کی عزت تو کی جاتی ہے مگر اسے واضح اور تنقیدی طور پر سمجھنے کا احساس نہیں ہوتا۔ مولانا کے لیے سب سے بڑا خراج تحسین یہ ہوگا کہ ہم ان اصولوں اور اقدار کو اپنائیں جس کی وہ زندگی بھر نمائندگی کرتے رہے۔ آزاد کے خوابوں کا ہندوستان ایک مضبوط خود اعتمادی سے معمور سیکولر ہندوستان تھا۔

مختصر سوال جواب:

سوال: انشائیہ کسے کہتے ہیں۔

جواب: انشائیہ نثری صنف ہے۔ ہلکے پھلکے مضمون کو انشائیہ (Light Essay) کہتے ہیں۔ انشائیہ زندگی کے کسی بھی موضوع پر لکھی ہوئی ایسی تحریر ہوتی ہے جس میں لکھنے والے کے جذبات اور اس کا انداز بیان شامل رہتا ہے۔ اُردو میں فرحت اللہ بیگ، خواجہ حسن نظامی اور ابوالکلام آزاد، مولوی عبدالحق، شوکت تھانوی، مشتاق احمد یوسفی وغیرہ مشہور انشائیہ نگار گزرے ہیں۔

سوال: ابوالکلام آزاد کا مختصر تعارف بیان کیجئے۔

جواب: مولانا ابوالکلام آزاد (1888-1958) نامور سیاست داں بے باک صحافی، ممتاز عالم دین، مفسر قرآن، خطیب، عالم دین، صحافی، سیاسی رہنما اور صاحب طرز ادیب تھے۔ وہ ہندوستان کی جدوجہد آزادی کے عظیم رہنما اور ہندوستانی مسلمانوں کی آبرو کی منفرد علامت تھے۔ مکہ معظّمہ میں پیدا ہوئے۔ بعد میں ہندوستان آئے۔ والد کی تربیت اور ذاتی قابلیت سے علم حاصل کیا۔ صحافت سے وابستہ ہوئے۔ الہلال اور البلاغ کے مدیر رہے۔ نہرو اور گاندھی کے ساتھ جدوجہد آزادی میں حصہ لیا۔ اور آزادی کے بعد ملک کے پہلے وزیر تعلیم بنے اور ہندوستان کے تعلیمی ڈھانچے کی بنیاد رکھی۔ ان کے خطوں کی مجموعہ غبار خاطر کے نام سے شائع ہوا۔

شیخ احمد ضیا

تعارف: شیخ احمد ضیاء شکر نگر نظام آباد سے تعلق رکھنے والے نامور شاعر اور انشاء پرداز ہیں۔ 25 جون 1960ء کو کرکھیلی ضلع ناندیڑ مہاراشٹرا میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام شیخ امین پٹیل تھا۔ شیخ احمد ضیاء نے جامعہ عثمانیہ سے ایم اے اردو کیا۔ شوگر ٹیکنالوجی کے شعبے میں تعلیم حاصل کی۔ ان دنوں نظام دکن شوگرس شکر نگر بودھن میں کوالٹی کنٹرول مینیجر ہیں۔ شیخ احمد ضیاء کی تصانیف زیر زبر پیش اور افکار تازہ شائع

ہوچکی ہیں۔ان کا شعری مجموعہ زیر ترتیب ہے۔ وہ اپنی مزاحیہ شاعری کے سبب بے حد مقبول ہیں۔آندھرا پردیش اور ملک و بیرون ملک مشاعروں میں شرکت کرتے ہیں۔طنز ومزاح کے ذریعے انہوں نے سماج کے مسائل کو اجاگر کیا ہے۔انہوں نے زندگی کے واقعات اور مشاہدات کو اپنے طنز ومزاح کا موضوع بنایا۔ان کی تحریر میں مزاح کی چاشنی پائی جاتی ہے۔طنزیہ مضمون ''اولڈ ایج ہوم'' میں انہوں نے عصر حاضر کے ایک اہم سماجی مسئلہ والدین کے ساتھ اولاد کے برتاؤ کو موضوع بنایا ہے۔

اولڈ ایج ہوم (طنزیہ مضمون/افسانہ)از: شیخ احمد ضیاء

ساحلی آندھرا کے علاقہ میں ایک چھوٹا سا شہر ''کرشنا راؤ پیٹ'' ہے۔اپنی سرسبزی وشادابی میں اپنی مثال آپ ہے۔قدرت نے اس علاقہ کو زرخیزی کی نعمت سے نوازا ہے۔کبھی کبھی یہ علاقہ طوفان و بادباراں کے قہر کا بھی شکار ہوجاتا ہے۔سینکڑوں کی تعداد میں ناریل کے درخت اس علاقہ کی خصوصی پہچان بن گئے ہیں۔کرشنا راؤ پیٹ تجارتی اعتبار سے بھی کافی اہمیت کا حامل ہے۔اور خوشحالی اس علاقے کا مقدر بن گئی ہے۔ان تمام خوبیوں کے ساتھ ساتھ اس شہر کی شہرت یہاں پر واقع ایک ''اولڈ ایج ہوم'' کی وجہ سے ہے۔جس میں 100 سے زیادہ ضعیف افراد کو زندگی کی تمام سہولتوں سے آراستہ ایک شاندار عمارت میں رکھا گیا ہے۔ 50 کمروں پر مشتمل یہ عمارت فن تعمیر کا بہترین نمونہ ہے۔اور اس کے ہر کمرے میں ضعیف افراد کی ضرورتوں کا مکمل خیال رکھا گیا ہے۔ یہاں کے مکینوں کے لئے یہ اولڈ ایج ہوم زندگی کا بہترین ساتھی بن گیا ہے۔اس اولڈ ایج ہوم کا انتظام ایک مقامی تنظیم کے ذمہ ہے۔جس کے ذمہ داران ضعیف افراد کی خدمت کو زندگی کا نصب العین بنائے ہوئے ہیں۔اس اولڈ ایج ہوم کے کمرہ نمبر 12 میں ایک جوڑا قیام پذیر ہے۔جن کے نام ہیں سری لتا اور موہن راؤ۔اس سے متصل کمرہ نمبر 13 میں ایک اور جوڑا رہتا ہے۔جن کے نام ہیں رحمت بی اور دلاور صاحب۔ دیگر کمروں میں بھی ضعیف جوڑے قیام پذیر ہیں جو اس اولڈ ایج ہوم کی خصوصی پہچان ہیں۔

کمرہ نمبر 12 کے مکین سری لتا اور موہن راؤ کی شادی تقریباً 30 سال قبل ایک چھوٹے سے دیہات میں انجام پائی۔شادی سے قبل دونوں کھیت مزدور تھے۔شادی کے بعد تقریباً دس سال تک وہ اولاد کی نعمت سے محروم رہے۔کافی منتوں مرادوں کے بعد انہیں اولاد کا سکھ نصیب ہوا۔اور انہیں ایک بیٹا ہوا۔گھر میں جشن منایا گیا اور سارے گاؤں میں بیٹے کی پیدائیش کی خوشی میں مٹھائی بانٹی گئی۔انہوں نے بیٹے کی آرزو کے لئے جہاں جہاں منتیں مانگیں وہاں نذرانے اور چڑھاوے پیش کئے۔ بیٹے کی لاڈ و پیار میں پرورش کی۔ جیسے جیسے لڑکا بڑا ہوتا گیا انہیں اس کی تعلیم کی فکر ستانے لگی۔ چونکہ وہ دونوں ایک دیہات میں رہتے تھے وہاں پر ان کے اکلوتے لڑکے کو مناسب تعلیم وتربیت ملنا ناممکن تھا۔اس لئے دونوں نے ایک دن طئے کیا کہ اس دیہات کو خیر باد کہتے ہوئے کسی شہر کا رُخ اختیار کیا جائے۔گاؤں کا گھر، زمین وغیرہ فروخت کرنے کے بعد انہوں نے اپنی اولاد کے اچھے مستقبل ک خاطر شہر کا رُخ کیا اور ایک چھوٹا سا مکان لے کر وہیں پر مستقل سکونت اختیار کر لی۔ اپنے لڑکے کے لئے انہوں نے شہر کے سب سے معیاری اسکول کا انتخاب کیا اور موہن راؤ نے ایک چھوٹی سی ہوٹل چلاتے ہوئے اپنی زندگی کا آغاز کیا۔سری لتا بھی محلے کے گھروں میں کام کرتے ہوئے اپنے شوہر کی مدد کرنے لگی۔زندگی کی گاڑی چلنے لگی۔اور میاں بیوی اپنے لڑکے کو دیکھ دیکھ کر جینے لگے۔لڑکے نے بھی تعلیم میں کافی دلچسپی دکھائی۔اور دیکھتے ہی دیکھتے انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کی۔جس دن سری لتا اور

موہن راؤ نے سمجھا کہ ان کی زندگی کے مقصد کی تکمیل ہوگئی ہے۔انہوں نے اپنے بیٹے کی شادی کر دینے کا فیصلہ کرلیا۔اوراس کے لئے ایک اچھی سی بہو کی تلاش شروع کردی۔اور چند ہی دنوں میں ایک غریب گھرانے کی خوبصورت لڑکی سے اپنے بیٹے کی شادی کردی۔بہو گھر آ گئی۔ شروع میں بہواور بیٹے نے دونوں کوسر پر بٹھایا۔لیکن جیسے جیسے دن گذرنے لگے ویسے ماں باپ ان کی نظروں میں کھٹکنے لگے۔بیٹا چھوٹی چھوٹی پر ماں باپ کوٹوکنے لگا۔اور کبھی کبھی اسے ماں باپ بوجھ بھی لگنے لگے۔بہوا پنی ساس سے گھر کے کام کاج لینے لگی۔اورخسر کوایک نوکر کی طرح دیکھنے لگے۔شروع میں موہن راؤاور سری لتا نے ان تمام باتوں کو برداشت کرلیا۔لیکن جب پانی سر سے اونچا ہوگیا اور بہواور بیٹے نے مل کر ایک رات جب انہیں گھر سے باہر سونے پر مجبور کردیا تو دونوں نے فیصلہ کرلیا کہ اب ان کا یہاں رہنا مناسب نہیں اور دوسرے دن کا سورج نکلنے سے قبل وہ دونوں کرشنا راؤ پیٹ پہونچ گئے۔جہاں پرایک نوجوان نے ان کے حال پرترس کھاتے ہوئے اولڈ ایج ہوم میں ان کے قیام کا انتظام کردیا۔اوراس دن سے وہ دونوں اسی اولڈ ایج ہوم کے کمرہ نمبر 12 میں اپنی موت کے انتظار میں زندگی گذار رہے ہیں۔انہیں اس اولڈ ایج ہوم میں یوں تو زندگی کی تمام آسائشیں میسر ہیں۔لیکن بیٹے سے جدائی کا کرب ان کی زندگی کا المیہ بن چکا ہے۔یہ تمام باتیں انہوں نے کمرہ نمبر 13 کے مکینوں رحمت بی اور دلاور صاحب کو سنائیں تو رحمت بی اور دلاور صاحب بھی رونے لگے۔اورانہوں نے بھی اس اولڈ ایج ہوم میں اپنی آمد کی داستان سنائی کہ کس طرح ان کے پانچ بیٹوں اور بہوؤں نے ان سے غلط برتاؤ کیا اورانہیں گھر سے باہر نکال دیا۔جب کہ انہوں نے بھی اپنے بچوں کی اچھے انداز میں پرورش کی تھی۔اورشادی کے بعد اپنی جائداد سب میں برابر تقسیم کی تھی۔انہیں اللہ نے پانچ بیٹے تو دئے لیکن کوئی بیٹی نہیں دی۔جس کا انہیں احساس تھا کہ کاش ایک بیٹی ان کا صحیح خیال رکھتی۔ان کے ناخلف بیٹوں نے شادیوں کے بعد ان کا یہ حال کردیا کہ انہیں اس اولڈ ایج ہوم میں پناہ لینی پڑی۔وہ بھی صبح سے شام تک روتے دھوتے زندگی کے بچے ایام گذار رہے تھے۔

آج اس اولڈ ایج ہوم کا یوم تاسیس منایا جارہا ہے۔سارے علاقے کو روشنیوں سے منور کردیا گیا۔آج سارے شہر میں اس تقریب کے چرچے ہیں۔ ہرطرف شامیانوں کی تنصیب عمل میں لائی جارہی ہے۔تمام ضعیف جوڑوں کو نئے ملبوسات سلوائے گئے۔اولڈ ایج ہوم میں جشن کا سماں ہے۔تمام مکین اپنے تمام غموں کو بھول کر آج اس خوشی کے موقع پر اس ادارہ کے منتظمین کو دعاؤں سے نواز رہے ہیں۔شام 6 بجے تقریب کا آغاز ہوگا۔تقریب کے دوران مہمان خصوصی کا خطاب ہوگا جو چیف ایگزیکٹیو انجنیئر ہیں۔شہر کے نامور انجنیئر ہیں۔آج ہی دوسر مقام سے تبادلہ پر آئے ہیں۔تقریب کے بعد ضعیف جوڑوں سے خصوصی ملاقات کریں گے۔کلچرل پروگرام ہوگا۔اور بہترین طعام کا انتظام بھی رہے گا۔شام میں ٹھیک 6 بجے مہمان خصوصی تشریف لائے۔میدان میں کافی بھیڑ تھی۔اوراسٹیج پر بیٹھے ہوئے لوگ دور سے نظر نہیں آرہے تھے۔مہمان خصوصی نے اپنی تقریر میں کافی نصیحت کی باتیں کیں اور نوجوانوں کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے ضعیف ماں باپ کا خاص خیال رکھیں اورانہیں بڑھاپے میں سہارا دیں۔تقریب کے بعد مہمان خصوصی اولڈ ایج ہوم کے مکینوں سے ملنے لگے۔ضعیف جوڑے انہیں دعائیں دینے لگے۔جب کمرہ نمبر 12 کے مکینوں کا سامنا ہوا۔مہمان خصوصی کو ایک جھٹکا لگا۔اورادھر سری لتا اور موہن راؤ بھی تقریباً بے ہوش ہوتے ہوئے رہ گئے کیونکہ یہ مہمان خصوصی کوئی اورنہیں بلکہ ان کا اپنا اکلوتا لڑکا ''کرشنا پرساد'' تھا۔

سوال: اردو افسانے کے آغاز وارتقاء کو بیان کیجئے؟

جواب: اردو کے افسانوی ادب میں داستان اور ناول کے بعد جس صنف کو مقبولیت ملی وہ افسانہ ہے۔اردو میں Short Story کو افسانہ کہا گیا ہے۔اس میں زندگی کے کسی ایک پہلو کو اجاگر کیا جاتا ہے۔ناول کے مقابلے میں افسانہ مختصر ہوتا ہے۔

بیسیوں صدی کے آغاز میں جبکہ صنعتی انقلاب نے زندگی کو مشینی بنا دیا تھا۔انسان وقت کی کمی کا شکار ہونے لگا اور کم وقت میں ادبی تفریح کا سامان تلاش کرنے لگا۔ایسے ماحول میں افسانہ کو مقبولیت ملی۔ناول کی طرح افسانہ میں بھی کہانی پلاٹ' کردار' منظر نگاری' مکالمہ نگاری وغیرہ عناصر پائے جاتے ہیں۔

اردو افسانے کے ابتدائی نقوش فورٹ ولیم کالج کے تحت لکھی گئی داستانوں میں بھی نظر آنے لگے تھے۔کیونکہ ان میں افسانیکے عناصر پائے جاتے ہیں۔تاہم افسانہ نگاری کی شعوری کوشش بیسویں صدی کے شروع میں ہوئی۔سجاد حیدر یلدرم نے ابتداء میں ترکی افسانوں کا اردو میں ترجمہ کرنا شروع کیا۔1900ء میں انہوں نے ''نشہ کی پہلی ترنگ'' کے عنوان سے اردو کا پہلا افسانے لکھا۔ 1907ء میں پریم چند کا افسانہ'' دنیا کا سب سے انمول رتن'' 'زمانہ' میں شائع ہوا۔یلدرم رومانیت کے علمبردار تھے۔پریم چند اصلاح وحقیقت پسندی کے نقیب تھے۔اسطرح یلدرم اور پریم چند کو اردو میں افسانہ نگاری کی دو جہتوں کا امام کہا جاسکتا ہے۔ابتدائی دور کے افسانوں میں ہندوستانی سماج اور یہاں کے سیاسی ومعاشرتی حالات بیان کئے گئے۔انگریزی تہذیب کا مذاق اُڑایا گیا۔پریم چند نے اپنے افسانوں میں دیہاتی زندگی کو پیش کیا۔کسانوں اور مزدوروں کے مسائل بیان کئے طبقاتی تقسیم مذہبی اجارہ داری وغیرہ کے خلاف انہوں نے آواز اٹھائی۔پریم چند کا شاہکار افسانہ ''کفن'' ہے۔جو اردو افسانہ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔اس افسانے کا موضوع مفلسی سے پیدا ہونے والی بے حسی ہے۔

افسانہ کے کردار باپ بیٹے' گھیسو اور مادھو ہندوستان کی غربت وافلاس کی تصویر پیش کرتے ہیں۔پریم چند ایک عہد ساز افسانہ نگار تھے انہوں نے اپنے فن کے ذریعہ دیگر افسانہ نگاروں کو بھی متاثر کیا۔پریم چند کے رنگ میں سدرشن' اعظم کریوی' سہیل عظیم آبادی اور علی عباس حسینی نے افسانے لکھے۔سدرشن نے شہر کے متوسط گھرانوں کے مسائل کو اپنے افسانوں میں بیان کیا۔ان کے اہم افسانے ''شاعر' مصور' ایک نامکمل کہانی' باپ وغیرہ ہیں۔علی عباس حسینی نے اپنے افسانوں میں انسانی نفسیات ازدواجی زندگی کے مسائل اور دیگر سیاسی وسماجی مسائل پر توجہ دی ہے۔ان کے اہم افسانے رفیق تنہائی' کڑوا گھونٹ' آئی۔سی۔ایس (ICS)' ہار جیت وغیرہ ہیں۔اعظم کریوی نے سیدھے سادھے اسلوب میں پریم چند کی طرح اپنے افسانوں میں حقیقت نگاری کو پیش کیا۔انکے اہم افسانے ہیرو' انصاف' دکھیا' کنول اور لاج ہیں۔

پریم چند کی حقیقت نگاری سے ہٹ کر اردو کے کچھ افسانہ نگار رومانی افسانے بھی لکھتے رہے۔ان میں سجاد حیدر یلدرم' نیاز فتح پوری' سلطان حیدر جوش' اور مجنوں گورکھپوری شامل ہیں۔یہ افسانہ نگار قاری کو حسین خوابوں کی سیر کراتے تھے۔1936ء میں اردو میں ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا۔لندن میں مقیم چند نوجوان ہندوستانی ادیبوں سجاد ظہیر' رشید جہاں' احمد علی اور محمود الظفر نے روایت سے ہٹکر کچھ افسانے لکھے۔یہ دس افسانے تھے جو 1932 میں ''انگارے'' کے نام سے شائع ہوئے۔ان افسانوں میں فرائڈ' مارکس' جیمز جوائس اور DH.Lawrence کے نظریات پیش کئے گئے۔اور مذہبی قیود و بند پر بھی آواز اٹھائی گئی۔روایت سے بغاوت کرنے والے افسانوں کے اس مجموعے کی کاپیاں ضبط کرلی گئیں۔لیکن انگارے کی اشاعت نے اردو افسانے کو نیا موڑ دیا۔1936 میں لکھنو میں پریم چند کی صدارت میں ترقی پسند تحریک کا پہلا اجلاس منعقد ہوا۔اس میں حقیقت نگاری کو اجاگر کرنے پر زور دیا گیا۔ ترقی پسند تحریک سے کئی افسانہ نگار ابھرے۔جن میں منٹو' بیدی' عصمت' کرشن چندر' احمد ندیم قاسمی' خواجہ احمد عباس اور عزیز احمد شامل ہیں۔کرشن چندر کے مشہور افسانے ان داتا' کالو بھنگی' مہالکشمی کا پل' گڈھا' آدھے گھنٹے کا خدا' فٹ پاتھ کے فرشتے وغیرہ مشہور ہیں۔

راجندر سنگھ بیدی نے اپنے افسانوں میں پنجاب کے دیہاتوں کی تصویر پیش کی۔عورت کے تقدس کو اجاگر کیا۔ان کے افسانوں کے مجموعے دانہ و دوام' کوکھ جلی' مکتی بودھ' گرہن' اپنے دکھ مجھے دے دو' ہاتھ ہمارے قلم ہوئے' وغیرہ ہیں۔ان کے مشہور افسانے لاج ونتی' اپنے دکھ مجھے دے دو' گرم کوٹ' چشم بدور' گرہن' بھولا وغیرہ ہیں۔اس دور کے اہم افسانہ نگار ''سعادت حسن منٹو'' ہیں۔جن پر ترقی پسندی رجعت پسندی اور جنس پرستی کا لیبل لگایا گیا۔ان کا ایک مشہور نفسیاتی افسانہ ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' ہے۔منٹو نے اپنے افسانوں میں الفاظ کو بڑی خوبی سے استعمال کیا ہے۔منٹو کے طرز پر خواتین کے مسائل کو اجاگر کرتے ہوئے عصمت چغتائی نے بھی اردو افسانے میں شہرت حاصل کی۔ان پر جنسی حقیقت نگاری کا الزام عائد کیا گیا۔عصمت کا ایک مشہور افسانہ ''چوتھی کا جوڑا'' ہے۔احمد ندیم قاسمی نے اپنے افسانوں میں پنجاب کی معاشرت کو پیش کیا۔اس دور کے دیگر افسانہ نگاروں میں حیات اللہ انصاری 'غلام عباس' خواجہ احمد عباس ممتاز شیریں' ممتاز مفتی' اختر حسین رائے پوری' حسن عسکری' اوپندر ناتھ اشک وغیرہ مشہور ہیں۔

عصمت کے علاوہ خاتون افسانہ نگاروں میں خدیجہ مستور اور ہاجرہ مسرور مشہور ہوئیں۔عزیز احمد ایک اور ترقی پسند افسانہ نگار تھے۔آزادی کے بعد اردو افسانہ کا موضوع بدلا' اور زندگی کے دیگر مسائل پر افسانے لکھے جانے لگے۔قراۃ العین حیدر نے اپنے افسانوں میں اودھ کی مٹتی جاگیر کا نوحہ سنایا تو انتظار حسین نے ہجرت کے کرب کو بیان کیا۔ 1960ء کے بعد اردو افسانے میں نئے تجربے ہوئے اور جدیدیت عصری ہیت' علامتی و تدریجی افسانے لکھے گئے۔

طویل سوالات:

سوال: افسانہ ''اولڈ ایج ہوم'' کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھئے۔(یا) افسانہ ''اولڈ ایج ہوم'' مغربی اقدار پر طنز اور اخلاقی گراوٹ کی عمدہ مثال ہے واضح کیجئے۔

جواب: **شیخ احمد ضیا تعارف:** شیخ احمد ضیاء شکر نگر نظام آباد سے تعلق رکھنے والے نامور شاعر اور انشاء پرداز ہیں۔25 جون 1960ء کو کرکھیلی ضلع ناندیڑ مہاراشٹرا میں پیدا ہوئے۔والد کا نام شیخ امین پٹیل تھا۔شیخ احمد ضیاء نے جامعہ عثمانیہ سے ایم اے اردو کیا۔شوگر ٹیکنالوجی کے شعبے میں تعلیم حاصل کی۔ان دنوں نظام دکن شوگرس شکر نگر بودھن میں کوالٹی کنٹرول مینیجر ہیں۔شیخ احمد ضیاء کی تصانیف زیر زبر پیش اور افکار تازہ شائع ہوچکی ہیں۔ان کا شعری مجموعہ زیر ترتیب ہے۔وہ اپنی مزاحیہ شاعری کے سبب بے حد مقبول ہیں۔آندھرا پردیش اور ملک و بیرون ملک مشاعروں میں شرکت کرتے ہیں۔طنز و مزاح کے ذریعے انہوں نے سماج کے مسائل کو اجاگر کیا ہے۔انہوں نے زندگی کے واقعات اور مشاہدات کو اپنے طنز و مزاح کا موضوع بنایا۔ان کی تحریر میں مزاح کی چاشنی پائی جاتی ہے۔طنزیہ مضمون ''اولڈ ایج ہوم'' میں انہوں نے عصر حاضر کے ایک اہم سماجی مسئلہ والدین کے ساتھ اولاد کے برتاؤ کو موضوع بنایا ہے۔

خلاصہ افسانہ: افسانہ ''اولڈ ایج ہوم'' میں افسانہ نگاری شیخ احمد ضیاء نے موجودہ سماج کے ایک کڑوے سچ کو پیش کیا کہ کس طرح مغربی ماحول کے زیر اثر آج کل کچھ نوجوان اپنے ضعیف والدین کی خود خدمت کرنے کے بجائے انہیں اولڈ ایج ہوم میں داخل کرا کے انہیں ذہنی تکلیف سے دوچار کررہے ہیں۔اس افسانہ میں ساحلی آندھرا کے علاقے کرشنا راؤ پیٹ میں قائم ایک اولڈ ایج ہوم کی کہانی پیش کی گئی ہے۔یہ علاقہ اس اولڈ ایج ہوم کی وجہ سے مشہور ہے۔ضعیفوں اور معذوروں کے لئے قائم کردہ اس بیت المعمرین میں 50 کشادہ کمرے ہیں جس میں 100 سے زیادہ افراد کے رہنے کی گنجائش ہے۔اس گھر کے کمرہ نمبر 12 میں موہن راؤ اور سری لتا رہتے ہیں۔

جب کہ اس سے متصل کمرہ نمبر 13 میں رحمت بی اور دلاور صاحب قیام پذیر ہیں۔ دیگر کمروں میں بھی ضعیف جوڑے قیام پذیر ہیں جو اس اولڈ ایج ہوم کی خصوصی پہچان ہیں۔

کمرہ نمبر 12 کے مکین سری لتا اور موہن راؤ کی شادی تقریباً 30 سال قبل ایک چھوٹے سے دیہات میں انجام پائی۔ شادی سے قبل دونوں کھیت مزدور تھے۔ شادی کے بعد تقریباً دس سال تک وہ اولاد کی نعمت سے محروم رہے۔ کافی منتوں مرادوں کے بعد انہیں اولاد کا سکھ نصیب ہوا۔ اور انہیں ایک بیٹا ہوا۔ گھر میں جشن منایا گیا اور سارے گاؤں میں بیٹے کی پیدائش کی خوشی میں مٹھائی بانٹی گئی۔ انہوں نے بیٹے کی آرزو کے لئے جہاں جہاں منتیں مانگیں وہاں نذرانے اور چڑھاوے پیش کئے۔ بیٹے کی لاڈ و پیار میں پرورش کی۔ جیسے جیسے لڑکا بڑا ہوتا گیا انہیں اس کی تعلیم کی فکر ستانے لگی۔ چونکہ وہ دونوں ایک دیہات میں رہتے تھے وہاں پر ان کے اکلوتے لڑکے کو مناسب تعلیم و تربیت ملنا ناممکن تھا۔ اس لئے دونوں نے ایک دن طئے کیا کہ اس دیہات کو خیر باد کہتے ہوئے کسی شہر کا رُخ اختیار کیا جائے۔ گاؤں کا گھر، زمین وغیرہ فروخت کرنے کے بعد انہوں نے اپنی اولاد کے اچھے مستقبل ک خاطر شہر کا رُخ کیا اور ایک چھوٹا سا مکان لے کر وہیں پر مستقل سکونت اختیار کر لی۔ اپنے لڑکے کے لئے انہوں نے شہر کے سب سے معیاری اسکول کا انتخاب کیا اور موہن راؤ نے ایک چھوٹی سی ہوٹل چلاتے ہوئے اپنی زندگی کا آغاز کیا۔ سری لتا بھی محلے کے گھروں میں کام کرتے ہوئے اپنے شوہر کی مدد کرنے لگی۔ زندگی کی گاڑی چلنے لگی۔ اور میاں بیوی اپنے لڑکے کو دیکھ دیکھ کر جینے لگے۔ لڑکے نے بھی تعلیم میں کافی دلچسپی دکھائی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کی۔ جس دن سری لتا اور موہن راؤ نے سمجھا کہ ان کی زندگی کے مقصد کی تکمیل ہوگئی ہے۔ انہوں نے اپنے بیٹے کی شادی کر دینے کا فیصلہ کر لیا۔ اور اس کے لئے ایک اچھی سی بہو کی تلاش شروع کر دی۔ اور چند ہی دنوں میں ایک غریب گھرانے کی خوبصورت لڑکی سے اپنے بیٹے کی شادی کر دی۔ بہو گھر آ گئی۔ شروع میں بہو اور بیٹے نے دونوں کو سر پر بٹھایا۔ لیکن جیسے جیسے دن گذرنے لگے ویسے ماں باپ ان کی نظروں میں کھٹکنے لگے۔ بیٹا چھوٹی چھوٹی پر ماں باپ کو ٹوکنے لگا۔ اور کبھی کبھی اسے ماں باپ بوجھ بھی لگنے لگے۔ بہو اپنی ساس سے گھر کے کام کاج لینے لگی۔ اور خسر کو ایک نوکر کی طرح دیکھنے لگے۔ شروع میں موہن راؤ اور سری لتا نے ان تمام باتوں کو برداشت کر لیا۔ لیکن جب پانی سر سے اونچا ہو گیا اور بہو اور بیٹے نے مل کر ایک رات جب انہیں گھر سے باہر سونے پر مجبور کر دیا تو دونوں نے فیصلہ کر لیا کہ اب ان کا یہاں رہنا مناسب نہیں اور دوسرے دن کا سورج نکلنے سے قبل وہ دونوں کرشنا راؤ پیٹ پہونچ گئے۔ جہاں پر ایک نوجوان نے ان کے حال پر ترس کھاتے ہوئے اولڈ ایج ہوم میں ان کے قیام کا انتظام کر دیا۔ اور اس دن سے وہ دونوں اسی اولڈ ایج ہوم کے کمرہ نمبر 12 میں اپنی موت کے انتظار میں زندگی گذار رہے ہیں۔ انہیں اس اولڈ ایج ہوم میں یوں تو زندگی کی تمام آسائشیں میسر ہیں۔ لیکن بیٹے سے جدائی کا کرب ان کی زندگی کا المیہ بن چکا ہے۔ یہ تمام باتیں انہوں نے کمرہ نمبر 13 کے مکینوں رحمت بی اور دلاور صاحب کو سنائیں تو رحمت بی اور دلاور صاحب بھی رونے لگے۔ اور انہوں نے بھی اس اولڈ ایج ہوم میں اپنی آمد کی داستان سنائی کہ کس طرح ان کے پانچ بیٹوں اور بہوؤں نے ان سے غلط برتاؤ کیا اور انہیں گھر سے باہر نکال دیا۔ جب کہ انہوں نے بھی اپنے بچوں کی اچھے انداز میں پرورش کی تھی۔ اور شادی کے بعد اپنی جائداد سب میں برابر تقسیم کی تھی۔ انہیں اللہ نے پانچ بیٹے تو دئے لیکن کوئی بیٹی نہیں دی۔ جس کا انہیں احساس تھا کہ کاش ایک بیٹی ان کا صحیح خیال رکھتی۔ ان کے ناخلف بیٹوں نے شادیوں کے بعد ان کا یہ حال کر دیا کہ انہیں اس اولڈ ایج ہوم میں پناہ لینی پڑی۔ وہ بھی صبح سے شام تک روتے دھوتے زندگی کے بچے ایام گذار رہے تھے۔

آج اس اولڈ ایج ہوم کا یوم تاسیس منایا جا رہا ہے۔ سارے علاقے کو روشنیوں سے منور کر دیا گیا۔ آج سارے شہر میں اس تقریب

کے چرچے ہیں۔ ہر طرف شامیانوں کی تنصیب عمل میں لائی جارہی ہے۔تمام ضعیف جوڑوں کو نئے ملبوسات سلوائے گئے۔اولڈ ایج ہوم میں جشن کا سماں ہے۔تمام مکین اپنے تمام غموں کو بھول کر آج اس خوشی کے موقع پر اس ادارہ کے منتظمین کو دعاؤں سے نواز رہے ہیں۔شام 6 بجے تقریب کا آغاز ہوگا۔تقریب کے دوران مہمان خصوصی کا خطاب ہوگا جو چیف ایگزیکٹیو انجنیر ہیں۔شہر کے نامور انجنیر ہیں۔آج ہی دوسر مقام سے تبادلہ پر آئے ہیں۔تقریب کے بعد ضعیف جوڑوں سے خصوصی ملاقات کریں گے۔کلچرل پروگرام ہوگا۔اور بہترین طعام کا انتظام بھی رہے گا۔شام میں ٹھیک 6 بجے مہمان خصوصی تشریف لائے۔میدان میں کافی بھیڑ تھی۔اور اسٹیج پر بیٹھے ہوئے لوگ دور سے نظر نہیں آرہے تھے۔مہمان خصوصی نے اپنی تقریر میں کافی نصیحت کی باتیں کیں اور نوجوانوں کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے ضعیف ماں باپ کا خاص خیال رکھیں اور انہیں بڑھاپے میں سہارا دیں۔تقریب کے بعد مہمان خصوصی اولڈ ایج ہوم کے مکینوں سے ملنے لگے۔ضعیف جوڑے انہیں دعائیں دینے لگے۔جب کمرہ نمبر 12 کے مکینوں کا سامنا ہوا۔مہمان خصوصی کو ایک جھٹکا لگا۔اور ادھر سری لتا اور موہن راؤ بھی تقریباً بے ہوش ہوتے ہوئے رہ گئے کیونکہ یہ مہمان خصوصی کوئی اور نہیں بلکہ ان کا اپنا اکلوتا لڑکا ''کرشنا پرساد'' تھا۔

مرکزی خیال: اولاد کو بے جا لاڈ پیار میں پرورش کرنے سے وہ والدین کے نافرمان اور بداخلاق ہوجاتے ہیں اور جس وقت ضعیف ماں باپ کو اولاد سے سہارے کی ضرورت ہے وہ انہیں بے سہارا چھوڑ دیتے ہیں۔اس لئے والدین کو چاہئے کہ وہ اپنے بچوں کی اچھی تربیت کریں۔

مختصر سوالات:

سوال: افسانے کی تعریف کیجئے۔

جواب: افسانہ یا مختصر کہانی اردو کے فسانوی ادب کی ایک صنف ہے۔جس میں زندگی کے کسی پہلو کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔افسانے میں پلاٹ، کہانی، کردار، مکالمے، منظر، زماں و مکاں، تجسس جیسے اجزا ہوتے ہیں۔افسانے کا عنوان اور انجام بھی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے ابتداء میں افسانے کو فروغ ملا۔پریم چند، کرشن چندر، بیدی، منٹو، عصمت وغیرہ اردو کے مشہور افسانہ نگار گذرے ہیں۔

سوال: شیخ احمد ضیا کا تعارف بیان کیجئے۔

جواب: جواب: شیخ احمد ضیا تعارف: شیخ احمد ضیاء شکر نگر نظام آباد سے تعلق رکھنے والے نامور شاعر اور انشاء پرداز ہیں۔25 جون 1960ء کو کرکھیلی ضلع ناندیڑ مہاراشٹرا میں پیدا ہوئے۔والد کا نام شیخ امین پٹیل تھا۔شیخ احمد ضیاء نے جامعہ عثمانیہ سے ایم اے اردو کیا۔شوگر ٹیکنالوجی کے شعبے میں تعلیم حاصل کی۔ان دنوں نظام دکن شوگرس شکر نگر بودھن میں کوالٹی کنٹرول مینیجر ہیں۔شیخ احمد ضیاء کی تصانیف زیر زبر پیش اور افکار تازہ شائع ہوچکی ہیں۔ان کا شعری مجموعہ زیر ترتیب ہے۔وہ اپنی مزاحیہ شاعری کے سبب بے حد مقبول ہیں۔آندھرا پردیش اور ملک و بیرون ملک مشاعروں میں شرکت کرتے ہیں۔طنز و مزاح کے ذریعے انہوں نے سماج کے مسائل کو اجاگر کیا ہے۔انہوں نے زندگی کے واقعات اور مشاہدات کو اپنے طنز و مزاح کا موضوع بنایا۔ان کی تحریر میں مزاح کی چاشنی پائی جاتی ہے۔طنزیہ مضمون ''اولڈ ایج ہوم'' میں انہوں نے عصر حاضر کے ایک اہم سماجی مسئلہ والدین کے ساتھ اولاد کے برتاؤ کو موضوع بنایا ہے۔

سوال: شیخ احمد ضیا کی تصانیف کے نام لکھئے۔

جواب: شیخ احمد ضیاء شکر نگر نظام آباد سے تعلق رکھنے والے نامور شاعر اور انشاء پرداز ہیں۔شیخ احمد ضیاء کی تصانیف زیر زبر پیش اور افکار تازہ

شائع ہوچکی ہیں۔ان کا شعری مجموعہ زیر ترتیب ہے۔

سوال: افسانہ ''اولڈ ایج ہوم'' کا مرکزی خیال بیان کیجئے۔

جواب: افسانہ اولڈ ایج ہوم میں افسانہ نگار شیخ احمد ضیاء نے موجودہ دور میں پھیلی ایک اہم سماجی برائی کی طرف روشنی ڈالی ہے کہ کس طرح دولت کے نشے میں چور بداخلاق اولاد اپنے بوڑھے ماں باپ کی خود پرورش کرنے کے بجائے انہیں اولڈ ایج ہوم میں چھوڑ دیتی ہے اور انہیں اپنے غلو عمل سے مسلسل اذیت دیتی ہے۔اس افسانے سے یہ سبق ملتا ہے کہ اولاد کو بے جا لاڈ پیار میں پرورش کرنے سے وہ والدین کے نافرمان اور بداخلاق ہوجاتے ہیں اور جس وقت ضعیف ماں باپ کو اولاد سے سہارے کی ضرورت ہے وہ انہیں بے سہار چھوڑ دیتے ہیں۔اس لئے والدین کو چاہئے کہ وہ اپنے بچوں کی اچھی تربیت کریں۔

معروضی سوال جواب برائے انٹرنل امتحان

☆ مثنوی کا لفظ کس زبان کے لفظ سے بنا ہے۔(عربی زبان کے لفظ۔مثنیٰ) سے

☆ مثنوی کسے کہتے ہیں۔(طویل بیانیہ نظم)

☆ مثنوی کی اہم خصوصیت کیا ہے۔(مافوق الفطرت عناصر)

☆ مثنوی کس دور کی یادگار ہے(شاہی دور)

☆ اردو کی پہلی مثنوی کونسی ہے اور اسے کس نے لکھا(کدم راؤ پدم راؤ۔فخر دین نظامی)

☆ مثنوی قطب مشتری کس نے لکھی(ملا وجہی)

☆ مثنوی سحر البیان کس نے لکھی(میر حسن)

☆ مثنوی گلزار نسیم کس نے لکھی(پنڈت دیا شنکر نسیم)

☆ اردو کی دو مشہور مثنویاں کونسی ہیں(سحر البیان۔گلزار نسیم)

☆ حالؔی کی مثنویوں کے نام لکھو(چپ کی داد۔مناجات بیوہ)

☆ مثنوی امن نامہ کس نے لکھی(جان نثار اختر)

☆ مثنوی امن نامہ میں کس جذبے کو پیش کیا گیا(وطن سے محبت)

☆ لفظ قصیدہ کس زبان کے لفظ سے بنا ہے(عربی لفظ قصد)

☆ قصد کے معنی کیا ہیں(ارادہ کرنا)

☆ کسی کی تعریف میں لکھی جانے والی نظم کو کیا کہتے ہیں(قصیدہ)

☆ تعریفی قصیدے کو کیا کہتے ہیں(مدحیہ قصیدہ)

☆ تنقیدی قصیدے کو کیا کہتے ہیں(ہجویہ قصیدہ)

☆ قصیدے کے اجزا کیا ہیں(مطلع۔تشبیب۔گریز۔دعا)

☆ قصیدے کے کس حصے میں بہار کا منظر بیان کیا جاتا ہے (تشبیب)

☆ قصیدے میں کیسی زبان استعمال کی جاتی ہے (بھاری بھرکم مشکل)

☆ اردو قصیدے کا نقاش اول کس شاعر کو کہا جاتا ہے (مرزا محمد رفیع سوداؔ)

☆ اردو قصیدے کو زوال کب آیا (شاہی دور کے زوال کے بعد)

☆ درشان حمید الدولہ قصیدہ کس نے لکھا (شیخ ابراہیم ذوقؔ)

☆ درشان حمید الدولہ قصیدہ کس کی شان میں لکھا گیا (نواب حمید الدولہ)

☆ درشان حمید الدولہ قصیدہ کس موقع پر لکھا گیا (عید کے موقع پر)

☆ مرثیہ کس زبان کے لفظ سے لیا گیا ہے (عربی لفظ۔رثٰی)

☆ مرثیہ کس قسم کی نظم ہوتی ہے (کسی کی موت پر اس کے اوصاف بیان کرتے ہوئے غم کا اظہار کرنا)

☆ اردو مرثیے میں کس واقعہ کو بیان کیا گیا (واقعہ کربلا)

☆ مرثیے کے کتنے اجزا ہیں (آٹھ)

☆ اردو مرثیے کے دو مشہور شاعر کون ہیں (میر انیسؔ۔مرزا دبیرؔ)

☆ ہندوستان کے کس شہر میں مرثیہ نگاری کو فروغ ملا (لکھنو)

☆ میر انیسؔ کے دادا کا نام کیا ہے (میر حسن)

☆ اردو مرثیے کس ہئیت میں لکھے جاتے ہیں (مسدس)

☆ مسدس کے ہر بند میں کتنے مصرعے ہوتے ہیں (چھ)

☆ مرثیہ گرمی کا سماں کس نے لکھا (میر انیسؔ)

☆ گرمی کا سماں میں کس بات کو پیش کیا گیا (واقعہ کربلا کے دن گرمی کی شدت)

☆ قطعہ کس زبان کا لفظ ہے (عربی)

☆ قعطہ کا مفہوم کیا ہے (ٹکڑا۔کاٹا ہوا حصہ)

☆ قطعہ میں کتنے مصرعے ہوتے ہیں (چار یا چھ)

☆ قطعہ کس صنف کا حصہ ہے (قصیدہ۔غزل)

☆ اردو نثر کی قدیم صنف کونسی ہے (داستان)

☆ داستان کس زبان کے لفظ سے لیا گیا ہے (فارسی۔پہلوی)

☆ داستان کسے کہتے ہیں (طویل قصہ۔قصوں کا مجموعہ)

☆ داستان کی ٹکنیک کیا ہوتی ہے (قصہ در قصہ)

☆ داستان میں کونسی کہانیاں بیان کی جاتی ہیں (خیالی)

☆ داستان میں کن عناصر سے مدد لی جاتی ہے (مافوق الفطرت)

☆ اردو کی پہلی داستان کونسی ہے (سب رس)

☆ داستان سب رس کے منصف کون ہیں (ملا وجہی)

☆ کس دور کا شاعر اور داستان نگار تھا (قطب شاہی دور۔دکن)

☆ سب رس کب لکھی گئی (۱۰۴۵۔ہجری)

☆ سب رس میں کونسا قصہ بیان کیا گیا (قصہ حسن و دل)

☆ سب رس کی زبان کیسی ہے (مقفیٰ و مسجع)

☆ داستانیں کس دور کی یادگار ہیں (شاہی دور)

☆ داستانوں کو زوال کب آیا (شاہی دور کے زوال کے بعد)

☆ ناول کس زبان کا لفظ ہے (اطالوی)

☆ ناول کا مطلب کیا ہے (انوکھا یا نرالا)

☆ ناول میں کہانی کس زندگی کی ہوتی ہے (حقیقی زندگی)

☆ اردو میں ناول نگاری کس زبان سے شروع ہوئی (انگریزی)

☆ اردو کا پہلا ناول کونسا ہے (خط تقدیر از مولوی کریم الدین)

☆ اردو کا پہلا ناول نگار کسے سمجھا جاتا ہے (ڈپٹی نذیر احمد)

☆ نصوح اور سلیم کی گفتگو۔کس ناول کا اقتباس ہے (توبۃ النصوح)

☆ انشائیہ کسے کہتے ہیں (ہلکے پھلکے نثری مضمون کو)

☆ اردو کے مشہور انشائیہ نگار کون ہیں (خواجہ حسن نظامی)

☆ ذوق چائے نوشی انشائیہ کس نے لکھا (ابوالکلام آزاد)

☆ ذوق چائے نوشی مضمون میں کہاں کا ماحول بیان کیا گیا ہے (جیل کا)

☆ ذوق چائے نوشی کس کتاب سے لیا گیا ہے (غبار خاطر)

☆ غبار خاطر کس کے خطوط کا مجموعہ ہے۔(ابوالکلام آزاد)